اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

"نہیں آتی کوئی مصیبت مگر اللہ کے اِذن سے!" — ڈاکٹر ابصار احمد — 3

تذکّر و تدبّر

مِلاکُ التأویل (۴۴) — ابو جعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی — 5

فہم القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی و نحوی تشریح — پروفیسر حافظ احمد یارؒ — 19

فکر و نظر

نوجوان اور فتنہ ہائے عصر — ڈاکٹر محمد رشید ارشد — 28

تعلیم و تعلّم

تعلیم کے اوّلین اُصول (۳) — از: ڈاکٹر محمد رفیع الدین — مترجم: پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف اعوان — 55

فکر و فلسفہ

مبادئ علم کلام (۴) — سعید عبد اللطیف فودہ/مکرم محمود — 68

ایمانیات

مباحثِ عقیدہ (۲۶) — مؤمن محمود — 77

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN — Dr. Israr Ahmad — 112

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

’’نہیں آتی کوئی مصیبت مگر اللہ کے اِذن سے!‘‘

ڈاکٹرابصاراحمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے ساتھ قریبی اور مسلسل تعلق رکھنے والے حضرات کے علم میں یقیناً ہوگا کہ راقم الحروف تقریباً چار ماہ سے علیل ہے۔ بنابریں، ’’حکمت قرآن‘‘ کے گزشتہ شمارے کا اداریہ بھی تحریر نہ ہوسکا۔ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ شدید ضمنی اثرات رکھنے والی بعض ادویات کے استعمال سے گلے کے صوتی اعصاب بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ جسمانی طور پر نقاہت اور کمزوری کے ساتھ آواز بھی اتنی دھیمی ہوچکی ہے کہ سامنے بیٹھا شخص بھی بات بمشکل ہی سمجھ پاتا ہے۔

بہرحال، یہ سب مشیتِ ایزدی کا ایک حصہ ہے۔ بفحوائے آیت قرآنی:

﴿مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ﴾ (التغابن:۱۱)

’’نہیں آتی کوئی مصیبت مگر اللہ کے اِذن سے!‘‘

دوسری جانب، ہمارا اس پر بھی کامل یقین ہے کہ:

﴿وَ اِذَا مَرِضۡتُ فَہُوَ یَشۡفِیۡنِ ﴿۸۰﴾﴾ (الشعراء)

’’اور جب میں بیمار ہوجاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔‘‘

چنانچہ رضا بالقضاء کا تقاضا یہی ہے کہ کسی تکلیف کی حالت میں بھی اَلْحَمْدُلِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ (ہر حال میں شکر اور تعریف اللہ ہی کے لیے ہے) کے الفاظ ہی ادا ہوں۔

’’توحید‘‘ ان اعمالِ باطنہ میں سے ایک ہے جن پر کاربند رہنا انسان کے ذمہ ضروری ہے۔ انسان کا ایمان ’’توحیدِ اعتقادی‘‘ پر موقوف ہے، جس کے بغیر وہ مسلمان ہی نہیں ہوسکتا۔ اس سے اگلا درجہ ’’توحیدِ عملی‘‘ ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ ہر آن یہ حقیقت نگاہوں کے سامنے رہے کہ اس دنیا میں پیش آنے والے تمام واقعات اللہ ہی کی طرف سے آتے ہیں۔ جب کسی انسان کو یہ کیفیت حاصل ہوجاتی ہے تو وہ لوگوں کی دشمنی اور دوستی سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔ وہ ظاہری اسباب کو محض ایک واسطہ سمجھتا ہے، اس سے زائد کچھ نہیں۔ انجامِ کار، تمام حرکات کی انتہا ایک ہی فاعلِ حقیقی پر ہوتی ہے، اور وہ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ!

فارسی کا ایک خوب صورت مقولہ ہے: ’’یکے بیں، یکے داں، یکے خواں، یکے جو، یکے گو!‘‘ یعنی ایک ہی کو دیکھ،

ایک ہی کو جان‘ ایک ہی کو پکار‘ ایک ہی کو تلاش کر‘ ایک ہی کی بات کر!

منتشر اور بے ترتیب خیالات پر مشتمل اس بکھری ہوئی تحریر کے آخر میں ایک کرم فرما کا صوتی پیغام پیش ہے:

’’محترم ڈاکٹر ابصار صاحب! ابھی عمار بیٹے نے آپ کی صحت کے بارے میں بتایا کہ دوبارہ کوئی چیسٹ انفیکشن ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامل شفا عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ تمام دکھ‘ درد‘ تکلیفیں دور کر دے اور اپنے خاص فضل و کرم سے آپ پر اپنی رحمت کا سایہ فرمائے۔ جیسے مشرق اور مغرب کی دوری ہے‘ ایسے ہی اللہ تعالیٰ اس بیماری اور آپ کے درمیان فاصلہ پیدا کر دے۔ لَا بَأْسَ طَهُوْرٌ، اِنْ شَاءَ اللّٰهُ، اَذْهِبِ الْبَاسَ رَبَّ النَّاسِ، وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِي، لَاشِفَاءَ اِلَّا شِفَاؤُكَ، شِفَاءً لَايُغَادِرُ سَقَمًا ۔ ان شاء اللہ‘ آپ صحت مند ہو جائیں گے اور اپنی زندگی کے معمولات میں دوبارہ لوٹ آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ مرکزی انجمن خدام القرآن اور ’’حکمتِ قرآن‘‘ کے حوالے سے انجام دی گئی دینی خدمات کو اللہ اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور اس کا بیش از بیش اجر عطا فرمائے۔ اپنی دعاؤں میں مجھے بھی یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ زندگی کے بقیہ ایام میں صحت اور عافیت کے ساتھ اپنی اور اپنے رسولؐ کی اطاعت کی توفیق عطا فرمائے۔ ہر قسم کے حاسدوں کے حسد سے‘ شیطان کے شر سے‘ نفس کے شر سے محفوظ رکھے۔ جزاک اللہ خیراً!‘‘

(نوٹ: محترم ڈاکٹر ابصار احمد نے اس تحریر کے خدوخال اور خاکہ نائب مدیر شعبہ مطبوعات جناب محمد خلیق سے زبانی طور پر بیان کیے تھے‘ جنہیں بعد ازاں عبارت کی صورت میں مرتب کیا گیا: ادارہ)

ایک اہم اطلاع

- مکتبہ خدام القرآن لاہور سے کتب اور جرائد کی خریداری کے لیے یا کسی قسم کی شکایت کی صورت میں ان واٹس ایپ نمبرز پر رابطہ کیجیے:

ہفت روزہ ندائے خلافت‘ ماہنامہ میثاق‘ سہ ماہی حکمت قرآن : 0341-4941212

کتب : 0301-1115348

- ادائیگی کے لیے صرف درج ذیل بینک اکاؤنٹ ہی میں رقم ارسال فرمائیں اور سکرین شاٹ کے ذریعے اس کی اطلاع بھی ضرور کیجیے کہ اسے کس مد میں ارسال کیا گیا ہے:

Dubai Islamic Bank

Account Title : Markazi Anjuman Khuddam Ul Quran (Maktaba)

Branch Code : 010

Branch Name : Peco Road,Lahore

IBAN : PK17DUIB0000000062871003

از: منیجر‘ مکتبہ خدام القرآن‘ قرآن اکیڈمی‘ لاہور

مِلاکُ التأوِیل (۴۴)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سُورۃُ الرُّوم

(۲۸۶) آیت ۹

﴿اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا﴾

’’کیا وہ زمین میں گھومے پھرے نہیں کہ وہ یہ دیکھ لیتے کہ ان سے پہلے والے لوگوں کا انجام کیا ہوا۔ وہ ان سے زیادہ طاقتور تھے اور انہوں نے زمین کو زرخیز بنایا اور اس کو اس سے زیادہ آباد کیا جتنا اوروں نے کیا تھا۔‘‘

سورۃ فاطر میں ارشاد فرمایا:

﴿اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ﴾ (آیت ۴۴)

’’کیا وہ زمین میں چلتے پھرتے نہیں تھے تو دیکھتے کہ ان سے پہلے لوگوں کا انجام کیا ہوا‘ حالانکہ وہ ان سے زیادہ قوت رکھتے تھے۔ اور اللہ کو آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز بھی عاجز نہیں کر سکتی۔‘‘

سورۃ غافر میں ارشاد فرمایا:

﴿اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۝۲۱﴾

’’کیا وہ زمین میں چلتے پھرتے نہیں تھے تو پھر یہ دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو ان سے پہلے تھے؟ وہ ان سے زیادہ قوت بھی رکھتے تھے اور زمین میں زیادہ یادگاریں بھی رکھتے تھے‘ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑ لیا۔ اور اللہ سے انہیں کوئی بچانے والا بھی نہیں تھا۔‘‘

اور اسی سورۃ کے آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ

﴿وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِی الْاَرْضِ فَمَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾

''کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان سے پہلے لوگوں کا کیا انجام ہوا۔ وہ تعداد میں ان سے زیادہ تھے' قوت میں ان سے زیادہ طاقتور تھے اور زمین میں اپنی یادگاریں بھی زیادہ رکھتے تھے' تو جو کچھ انہوں نے کمایا تھا ان کے کام نہیں آیا۔''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان تینوں آیات کا مقصد تو ایک ہی ہے لیکن الفاظ میں کمی بیشی یا بیان میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے تو اس کا کیا سبب ہے؟

دونوں سوالات کا مجمل جواب تو یہ ہے کہ ان تمام آیات کا مقصود تو ایک ہی ہے کہ تم ان قوموں کے انجام سے عبرت حاصل کرو جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں' لیکن اختلاف اس بات میں ہے کہ جس جس سورت میں تنبیہ کے یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ ''کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں!'' تو کیا اس سورت میں اس سے قبل یا اس کے بعد مذکورہ ہلاک شدہ قوم یا اقوام کے حالات یا ان کے مجادلات کا اختصاراً یا اشارتاً بیان ہوا ہے یا نہیں! ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے رسولوں کا جھٹلانا اور پھر عذاب میں مبتلا کیا جانا ایک جگہ پہلے ذکر کیا گیا ہو اور پھر آیت تنبیہ (وہ آیت کہ جس میں عبرت پکڑنے کا ذکر کیا جا رہا ہے) کا ذکر کیا گیا ہو۔

اب ملاحظہ ہو کہ سورۃ الروم کے آغاز میں پہلی مرتبہ یہ آیت لائی گئی جس میں کہا گیا کہ تم سے قبل بھی بڑے سورما اور طاقت کے نشے میں مبتلا لوگ پائے گئے تھے' لیکن وہاں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ کسے نشانہ عذاب بنایا گیا اور کس کو نجات ملی' لیکن پھر آیت ۴۷ میں اس ابہام کو کھول دیا گیا۔ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰی قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾﴾

''اور ہم نے تم سے قبل کئی رسولوں کو ان کی قوموں کی طرف بھیجا تو وہ ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے' تو پھر ہم نے مجرمین سے انتقام لیا۔ اور ہمارے اوپر اہلِ ایمان کی مدد کرنا ایک حق تھا۔''

اگر دونوں آیات کو ملا کر پڑھا جائے تو مضمون یوں بنے گا:

''کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان سے پہلے لوگوں کا کیا حشر ہوا' حالانکہ وہ اپنی قوت' اپنی کثرت' زمین میں اپنی یادگاروں اور اپنی طویل عمروں کے لحاظ سے تم سے کہیں زیادہ تھے۔ پھر جب اللہ کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا' تو ہم نے جھٹلانے والوں اور جرم کرنے والوں سے خوب انتقام لیا' اور جو لوگ ایمان لے آئے تھے ان کی مدد کی اور یہ ان کا حق تھا کہ ہم ان کی مدد کرتے' اور جن سے ہم نے انتقام لیا' ان پر ہم نے ظلم نہیں کیا۔''

اور یہ آخری بات سورۃ الروم اور کئی دوسری آیات میں ذکر کی گئی ہے:

﴿فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۹﴾﴾

''اور اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں۔''

اب اگر یہ کہا جائے کہ کیا ایسا زیادہ مناسب نہ ہوتا کہ یہ دوسری آیت جس میں مجرمین سے انتقام لینے کا ذکر ہے، پہلی آیت کے ساتھ ہی متصل ہوتی تا کہ جہاں پچھلی قوموں کی قوت و کثرت کا ذکر ہے اور ان سے عبرت پذیری کی ہدایت کی گئی ہے وہیں اس بات کا بھی ذکر آ جاتا کہ ان سے ان کی نافرمانی کی بنا پر انتقام بھی لے لیا گیا!!

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کا ایک خاص اسلوب ہے کہ جہاں خلقِ خدا کو ایمان کی طرف بلایا جا رہا ہو تو دعوت میں نرمی، شفقت اور لطافت کا خیال رکھا جائے۔ ملاحظہ ہو کہ اس ضمن میں اللہ کے رسولوں کو خاص طور پر کہا گیا:

﴿اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَ جَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ ؕ﴾ (النحل:۱۲۵)

’’اپنے رب کے راستے کی طرف بلاؤ حکمت کے ساتھ، اچھے پیرائے میں اور ان سے احسن طریق کے ساتھ حُجّت بازی کرو۔‘‘

موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کیا گیا تو فرمایا: ﴿وَ ذَکِّرۡہُمۡ بِاَیّٰىمِ اللّٰہِ ؕ﴾ (ابراھیم:۵) ’’اور انہیں اللہ کے (مشہور) دنوں کی یاد دلاتے رہو!‘‘ یعنی وہ دن کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی نعمتوں سے نوازا تھا۔ اور فرمایا: ﴿یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ﴾ (البقرۃ:۴۰) ’’اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمہیں دی تھی۔‘‘ اور یہ بھی یاد دلایا: ﴿یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ قَدۡ اَنۡجَیۡنٰکُمۡ مِّنۡ عَدُوِّکُمۡ﴾ (طٰہٰ:۸۰) ’’اے بنی اسرائیل! ہم نے تمہیں تمہارے دشمن سے نجات عطا کی۔‘‘ اور یہ اسلوب قرآن میں کثرت سے نظر آئے گا۔

سورۃ الروم کے آغاز ہی میں اہلِ مکّہ کو پچھلوں کے حالات سے عبرت پکڑنے کی نصیحت کی گئی لیکن اس سے قبل کوئی ایسی آیت نہیں لائی گئی جس میں کوئی لطافت اور شفقت سے بھرپور اندازِ دعوت ہو، تو اس لیے مناسب نہ تھا کہ سوائے اشارے، کنایے کے مکذبین کے انجام کا ذکر ہو۔ چنانچہ اس میں اشارتاً اتنا کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، لیکن یہ تفصیل کہ ان سے انتقام لیا گیا تھا اسے بعد کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ اور وہاں بھی جب ذکر کیا گیا تو اس پیرائے میں کہ وہاں دعوتِ ایمان کا کوئی ذکر نہ تھا۔ چنانچہ بعد کی آیات میں آیت نمبر ۴۷ وہ مقام ہے جہاں مکذبین سے انتقام لینے اور اہلِ ایمان کی مدد کرنے کا صراحتاً ذکر آ جاتا ہے۔ تو یہ وجہ ہوئی کہ دونوں آیات کو ایک ساتھ نہیں لایا گیا بلکہ اس میں تفریق روا رکھی گئی۔

اب ہم سورۂ فاطر کی آیت کی طرف آتے ہیں۔ اس آیت سے قبل آیات ۲۵۔۲۶ میں نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیفِ قلب اور تسلی کے لیے ان الفاظ سے خطاب کیا گیا:

﴿وَ اِنۡ یُّکَذِّبُوۡکَ فَقَدۡ کَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ۚ جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ بِالزُّبُرِ وَ بِالۡکِتٰبِ الۡمُنِیۡرِ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَخَذۡتُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَکَیۡفَ کَانَ نَکِیۡرِ ﴿۲۶﴾﴾

’’اور اگر یہ لوگ آپؐ کو جھٹلا رہے ہیں تو جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں، انہوں نے بھی جھٹلایا تھا۔ ان کے پاس بھی ان کے پیغمبر کھلی نشانیاں، صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے۔ پھر مَیں نے کافروں کو آ پکڑا

تو دیکھو کیسی ہوئی ان پر میری پھٹکار!''

اور پھر چند آیات کے بعد آیت تنبیہ کا ذکر ہوا جس میں کہا گیا تھا:

''کیا وہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو ان سے پہلے گزر چکے تھے' وہ ان سے زیادہ طاقتور تھے۔''

''اور (اے محمد ﷺ!) پھر ہم نے انہیں ایسا پکڑا کہ ان میں سے کوئی ایک بھی بچ نہ سکا۔''

''اور وہ اس لیے کہ آسمانوں اور زمین میں اللہ کو کوئی بھی عاجز نہیں کر سکتا اور نہ کوئی اس سے بھاگ سکتا ہے۔''

ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھا جائے تو آغاز اور انجام آپس میں ملتے نظر آتے ہیں۔ پہلی آیت میں صاف طور پر بتایا گیا تھا کہ اللہ نے انہیں اپنی پکڑ میں لے لیا اور دوسری آیت میں اسی بات کو بطور اشارہ بتایا گیا کہ کوئی بھی شخص اللہ کی پکڑ سے باہر نہیں ہو سکتا۔ یوں دونوں آیات کی اپنی اپنی جگہ مناسبت بھی ہے اور دونوں کے مضامین میں یکسانیت بھی ثابت ہو جاتی ہے۔

اب رہی سورۂ غافر کی آیات تو سوال کرنے والا سوال کر سکتا ہے کہ جس اصول اور قاعدے کا آپ ذکر کر رہے ہیں' اس کا اطلاق تو یہاں نہیں ہوتا۔ یعنی دعوتِ دین دیتے وقت عمومی طور پر نرمی' شفقت اور لطافتِ بیانی کا لحاظ رکھا جاتا ہے' ایک دم سے عذاب کی وعید نہیں دی جاتی' جبکہ ان آیات میں اوّل تو کوئی تدریج نہیں رکھی گئی بلکہ جہاں ان کی قوت' کثرت اور طاقت کے گھمنڈ کا تذکرہ کیا گیا تو وہیں ان کے پکڑے جانے کی وعید بھی سنا دی گئی' اور پھر اگلی آیت میں اس کا سبب بھی بتا دیا گیا۔ فرمایا:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۲﴾﴾

''اور وہ اس لیے کہ ان کے پاس انہی کے رسول کھلی نشانیاں لے کر آتے رہے تو ان لوگوں نے انکار کیا تو پھر اللہ نے انہیں پکڑ لیا۔ بے شک وہ طاقت ور ہے اور سخت سزا دینے والا ہے۔''

یہ درست ہے کہ اس سورت میں نرمی اور لطافتِ بیان کا وہ خیال نہیں رکھا گیا کہ جس کا بیان تفصیل سے ہو چکا ہے' اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سورت کی ابتدا ہی ان کی سیہ کاریوں کے بیان سے ہوتی ہے کہ ان لوگوں نے اپنے انبیاء کے ساتھ کیسے بدسلوکی سے برتاؤ کیا' بے جا حجّت بازی کی' تو یہاں موقع نہیں تھا کہ نرمی اور شفقت سے خطاب کیا جائے۔ سورت کے آغاز ہی میں فرمایا:

﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۠ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۢ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۣ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۵﴾﴾

''ان سے پہلے نوح کی قوم نے جھٹلایا اور ان کے بعد کے گروہوں نے بھی' اور ہر اُمّت نے اپنے رسول پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ کیا اور باطل کی اساس پر حُجّت بازی کی تاکہ اس طرح حق کو پسپا کر ڈالیں تو مَیں نے انہیں دھر لیا۔ تو دیکھو میرا عذاب کیسا ہوا!''

دوسری آیاتِ تنبیہ کی طرح یہاں اشارے کنائے سے کام نہیں لیا گیا' بلکہ ان کے جرم کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے سیدھا سیدھا خطاب ہوا کہ چونکہ تم نے یہ کچھ کیا تھا اس لیے تمہیں سزا دی گئی۔

ابنِ عامر کی قراءت میں (سورۂ غافر کی زیر مطالعہ آیت ۲۱ میں) بجائے ''مِنۡھُمۡ'' کے ''مِنۡکُمۡ'' آیا ہے۔ ''مِنۡھُمۡ'' سے مراد یہ تھا کہ وہ لوگ ان موجودہ (قریش' اہلِ مکّہ) سے زیادہ بااثر اور طاقتور تھے اور ''مِنۡکُمۡ'' میں ضمیرِ خطاب لا کر کلام میں اور زیادہ زور پیدا کیا گیا کہ وہ لوگ تم سے زیادہ بااثر اور طاقتور تھے۔

پھر یہی بات سورت کے آخر میں ان الفاظ کے ساتھ بیان ہوئی:

﴿اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ کَانُوۡۤا اَکۡثَرَ مِنۡہُمۡ وَاَشَدَّ قُوَّۃً وَّاٰثَارًا فِی الۡاَرۡضِ فَمَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۸۲﴾﴾

اس آیت کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿فَلَمَّا جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَرِحُوۡا بِمَا عِنۡدَہُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ وَحَاقَ بِہِمۡ مَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۸۳﴾﴾

''پس جب ان کے پاس ان کے رسول کھلی نشانیاں لے کر آئے تو وہ اس علم پر اِترانے لگے جو اُن کے پاس تھا' اور پھر جس چیز کا مذاق اُڑا رہے تھے' اسی نے انہیں آلیا۔''

یہاں ان حُجّت بازیوں کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر سورت کے آغاز میں اور سورۃ الکھف میں کیا گیا تھا:

﴿وَیُجَادِلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِالۡبَاطِلِ لِیُدۡحِضُوۡا بِہِ الۡحَقَّ﴾ (الکھف:۵۶)

''اور کفار باطل کے سہارے جھگڑتے ہیں تاکہ اس سے حق کو پسپا کر سکیں۔''

وہ اپنے زعم میں اسے علم سمجھتے تھے اور اسی بنا پر انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ پر طرح طرح کے بہتان لگائے۔ کہا کہ جو کچھ وہ بتا رہے ہیں وہ ''اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ'' (النحل:۲۴) (پچھلے لوگوں کے افسانے) ہیں۔ اور یہ الزام بھی لگایا: ﴿مَا ھٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّفۡتَرًی﴾ (القصص:۳۶) ''یہ تو صرف گھڑا گھڑایا جادو ہے۔'' اور پھر یہ بھی دعویٰ کیا: ﴿لَوۡ نَشَآءُ لَقُلۡنَا مِثۡلَ ھٰذَاۤ﴾ (الانفال:۳۱) ''اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا (کلام) لا سکتے ہیں۔'' گویا ان کے زعم میں یہ سب ان کا علم تھا۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے یہ کہا گیا: ﴿اَیۡنَ شُرَکَآءِیَ﴾ (النحل:۲۷' القصص:۶۲۔۷۴' فصلت:۴۷) ''کہاں ہیں میرے شریک؟'' یعنی تمہارے زعم کے مطابق وہ کہاں ہیں جن کو تم میرا شریک ٹھہراتے تھے؟ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر شریک سے بالا ہے۔ یا علم سے مراد ان کا وہ غور وفکر ہے جو انہیں اس نتیجے پر لے گیا کہ آخرت تو ایک انہونی چیز ہے۔ وہ جسم جو موت کے بعد گل سڑ جائیں گے یا دوسرے حیوانات کی خوراک بن جائیں گے ان کو دوبارہ اکٹھے کیسے کیا جا سکتا ہے؟ جیسا کہ انہوں نے کہا:

﴿مَنۡ یُّحۡیِ الۡعِظَامَ وَہِیَ رَمِیۡمٌ ﴿۷۸﴾﴾ (یٰسٓ)

''کون ہے جو ہڈیوں کو ان کے گل سڑ جانے کے بعد زندہ کر سکے گا؟''

﴿ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿٩٨﴾ ﴾ (الاسراء)

''اور انہوں نے کہا: کیا جب ہم ہڈیاں بن جائیں گے اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا۔''

یہ غور و فکر دو بہت ہی کمزور قاعدوں پر مشتمل ہے: ایک تو اللہ کی قدرت کا انکار اور دوسرے اس بات کا انکار کہ اللہ صرف کلیات کو جانتا ہے جزئیات کو نہیں۔ یہ قول ارسطو اور اس کے پیروکار مشائین کا ہے۔ یہ وہ فلاسفہ یونان ہیں جنہوں نے اجسام کے دوبارہ اٹھائے جانے کا مذکورہ دو قاعدوں کی بنا پر انکار کیا ہے۔ لیکن یہ تمام فلاسفہ کا قول نہیں ہے' افلاطون اور اس کے ہم نوا متشرعین نے اس قول کی مخالفت کی ہے۔ جالینوس کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ اس نے اس بارے میں توقف کیا ہے۔ (۱)

مسلمان فلاسفہ نے شریعت کا بھرم قائم کرنے کے لیے حشرِ اجساد کی تاویل کی اور اُسے روحانی حشر سے تعبیر کیا۔ منکرین چونکہ قدرت کے بھی قائل نہ تھے اور یہ بھی نہیں مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو جزئیات کا علم ہے' اس لیے قرآن مجید میں جہاں بھی قیامت کے دن اٹھائے جانے کا ذکر ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفات یعنی قدرت اور علم کا بھی ذکر کیا گیا ہے تاکہ منکرین پر حُجّت قائم ہو سکے۔ سورۃ الروم کی آیات ملاحظہ ہوں:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ۭ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٢٧﴾ ﴾ (الروم)

''اور وہی ہے جس نے پہلے پہل پیدا کیا پھر وہ دوبارہ اسے لوٹائے گا اور یہ بات اس کے لیے بہت آسان ہے۔ اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی بہترین اور اعلیٰ صفت ہے' اور وہی غلبے والا اور حکمت والا ہے۔''

دیکھیے یہاں اللہ تعالیٰ کی دو صفات العَزِیز (بمعنی قادر اور غالب) اور الحَکِیم (بمعنی حکمت اور علم والا) کا ذکر کیا گیا۔

سورۃ یٰسٓ میں ارشاد فرمایا:

﴿ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴿٧٨﴾ ﴾

''اور اس نے ہمارے لیے مثال بیان کی اور خود اپنی پیدائش کو بھول گیا۔ اس نے کہا: ہڈیوں کو جب کہ وہ گل سڑ جائیں کون زندہ کر سکتا ہے؟''

﴿ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ﴿٧٩﴾ ﴾

---

(۱) مَشّائین، ''مَشی'' (چلنا پھرنا) سے نکلا ہے۔ چونکہ ارسطو اپنے مدرسے کی راہداریوں میں چلتے پھرتے درس دیتا تھا' اس لیے اس کے تلامذہ کو ''مشائین'' کہا گیا۔ ارسطو نے جسمانی حشر (اجساد) کا انکار کیا۔ افلاطون اور اس کے ہم نوا مسلم فلاسفہ کو متشرعین کہا گیا کہ وہ روحانی طور پر حشرِ اجساد کے قائل ہیں تاکہ شریعت کا بھرم باقی رہے۔ جالینوس ایک مشہور طبیب گزرا ہے اور وہ بھی حشرِ اجساد کے بارے میں یا تو شک کا شکار رہے یا وہ بھی منکرین میں سے شامل ہے۔ یہ کہنا کہ اس نے اس بارے میں توقف کیا ہے' درست نہیں ہے۔ (ص ح)

’’کہہ دیجیے: وہی زندہ کرے گا جس نے پہلی دفعہ انہیں پیدا کیا تھا۔اور وہ ہر طرح کی پیدائش سے بخوبی واقف ہے۔‘‘

یہ الفاظ (یُحۡیِیۡهَا اور اَنۡشَاَهَاۤ) اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جس کے بارے میں اگلی آیت بالکل صریح الفاظ کے ساتھ آئی ہے:

﴿اَوَلَیۡسَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ ؕ بَلٰی ٭ وَهُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۸۱﴾﴾

’’بھلا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ اُن جیسوں کو پھر پیدا کر دے۔ کیوں نہیں! وہی تو پیدا کرنے والا اور علم والا ہے۔‘‘

اس مضمون کا احاطہ کہ جس میں کفار کے اقوال اور پھر ان کی تردید اپنی اپنی جگہ پر بار بار بیان ہوتی رہی ہے‘ ہمارے ائمہ نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ جو بھی کتاب اللہ کا غور و تدبّر کے ساتھ مطالعہ کرے گا اُسے پورا اطمینان اور یقین حاصل ہوگا۔ ہم جس بات کو واضح کرنا چاہتے ہیں وہ یہی ہے کہ کفار اپنے اقوال کو اپنے زعم میں علم سمجھتے تھے‘ تو انہی کے زعم کے اعتبار سے اسے علم کہا گیا اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ ان کا یہ مزعومہ علم ہی انہیں لے ڈوبا۔ اور یہ کہ ان چاروں آیات میں موقع و محل کی مناسبت سے کفار کے مجادلے کا ذکر کیا گیا ہے اور جتنا کچھ جس آیت میں کہا گیا ہے وہ اس آیت سے مناسبت رکھتا ہے‘ واللہ اعلم!

(۲۸۷) آیات ۲۱ تا ۲۴

﴿وَمِنۡ اٰیٰتِهٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡکُنُوۡۤا اِلَیۡهَا وَجَعَلَ بَیۡنَکُمۡ مَّوَدَّةً وَّرَحۡمَةً ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾

’’اور اُس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تا کہ تم ان (کی صحبت) سے سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور نرمی رکھی۔ یقیناً اس بات میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔‘‘

﴿وَمِنۡ اٰیٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِکُمۡ وَاَلۡوَانِکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡعٰلِمِیۡنَ ﴿۲۲﴾﴾

’’اور اُس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اُس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لیے طرح طرح کی زبانیں اور رنگتیں بنائیں۔ یقیناً اس بات میں علم رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔‘‘

﴿وَمِنۡ اٰیٰتِهٖ مَنَامُکُمۡ بِالَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَابۡتِغَآؤُکُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ ﴿۲۳﴾﴾

’’اور اُس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن کو نیند (کے مزے) لینا بھی ہے‘ اور اُس کے فضل (روزگار) کی تلاش بھی۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو (کان لگا کر) سنتے ہیں۔‘‘

﴿وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ يُرِيۡكُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحۡيٖ بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۲۴﴾﴾

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ تمہیں آسمانی بجلی دکھاتا ہے جس میں ڈر بھی ہے اور اُمید بھی' اور آسمان سے پانی اتارتا ہے تو اس کے ذریعے مُردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔''

یہاں سوال کرنے والا یہ سوال کرسکتا ہے کہ ان میں سے ہر آیت کے بعد عبرت پکڑنے والوں کا الگ الگ وصف بیان کیا گیا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے (واللہ اعلم) کہ پہلی آیت میں ان چیزوں کی طرف توجہ دلائی گئی:

(۱) اللہ تعالیٰ نے زوجین کے درمیان ایسی کشش رکھی کہ وہ ایک دوسرے کی صحبت میں اطمینان اور سکون پاتے ہیں اور پھر یہی کشش نسلِ انسانی میں کثرت کا باعث بنتی رہتی ہے۔

(۲) پھر اللہ تعالیٰ نے زوجین کے مابین محبت' شفقت اور نرمی کے جذبات رکھے تاکہ وہ باہمی زندگی کو احسن طریقے سے گزارنے کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کرتے رہیں۔

(۳) پھر اولاد کی موجودگی میں اولاد کی محبت اور ان کو پالنے میں ایک دوسرے کا سہارا بننے کی قابلیت پیدا کی۔

یہ ساری باتیں ایک طویل تجربے اور انتہائی غور وفکر کی محتاج ہیں' اس لیے مناسب تھا کہ آخر میں یہ کہا جاتا: ﴿اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾

دوسری آیت میں زمین وآسمان کی پیدائش اور زبانوں اور رنگوں کے تنوع کا ذکر کیا گیا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے ماوراء ایک ایسی عظیم ذات یقیناً ہوگی جس نے اتنی وسیع اور عظیم کائنات کی تخلیق کی۔ اور وہ ذات جو خود زبانوں اور رنگوں کی خالق ہو تو وہ ان کے مشابہ کیسے ہوسکتی ہے۔ یہ اتنی واضح بات ہے کہ ذرا سی بھی عقل رکھنے والا فوراً ہی سمجھ سکتا ہے' اور پھر انسان حیرت زدہ رہ جاتا ہے جب اس کی نظر ان عجائبات پر پڑتی ہے جو اجرامِ سماویہ کے اندر پنہاں ہیں۔ اب دیکھئے کہ آسمان وزمین کے کن کن پہلوؤں کی طرف آیاتِ قرآنیہ میں توجہ دلائی گئی۔ ایک جگہ کہا گیا:

﴿اِنَّ فِيۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ﴾ (البقرۃ:۱۶۴' آل عمران:۱۹۰)

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے اُلٹ پھیر میں نشانیاں ہیں۔''

اور کہیں کہا گیا: ﴿اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰيٰتٍ﴾ (الجاثیۃ:۳)

''بے شک آسمانوں اور زمین میں نشانیاں ہیں۔''

یعنی خود ان کی اپنی ہیئت اور پیدائش میں اور پھر ان کے اندر جو مزید عجائب ہیں' ان میں بھی ایسے ایسے کمالات پوشیدہ ہیں جن پر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے' اور پھر زمین کا خصوصی ذکر کیا گیا:

﴿وَفِي الۡاَرۡضِ اٰيٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِيۡنَ ﴿۲۰﴾﴾ (الذّاریات)

”اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔“

زمین کے عجائبات اگر دیکھے جائیں تو وہ ختم ہونے کو نہیں آتے۔ پھر زمین اور آسمان دونوں کا ذکر کیا گیا۔ فرمایا:

﴿ اَفَلَمۡ یَنۡظُرُوۡۤا اِلَی السَّمَآءِ فَوۡقَهُمۡ كَیۡفَ بَنَیۡنٰهَا وَزَیَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنۡ فُرُوۡجٍ ۞ وَالۡاَرۡضَ مَدَدۡنٰهَا وَاَلۡقَیۡنَا فِیۡهَا رَوَاسِیَ وَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍۢ بَهِیۡجٍ ۞ ﴾ (ق)

”کیا وہ اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھتے کہ ہم نے اسے کیسے بنایا‘ کیسے اسے زینت عطا کی‘ اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں۔ اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا‘ اس میں پہاڑ ایستادہ کر دیے اور اس میں ہر طرح کی نباتات کے خوش نما جوڑے بنائے۔“

سورۃ البقرۃ کے آغاز میں لوگوں کو اپنے ربّ کی عبادت کی طرف بلایا گیا ہے کہ جس نے انہیں پیدا کیا اور ان سے پہلے جو لوگ تھے‘ انہیں بھی پیدا کیا۔ اور پھر زمین و آسمان کی انہی نشانیوں کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا:

﴿الَّذِیۡ جَعَلَ لَكُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۠﴾ (البقرۃ:۲۲)

”جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور آسمان کو ایک عمارت!“

پھر ان نشانیوں کو بارہا آیاتِ قرآنی میں جگہ دی۔ چونکہ انسان کائنات کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے اس لیے ان سے عبرت پذیری آسانی سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا: ﴿اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡعٰلِمِیۡنَ ۞﴾ ”بے شک اس میں علم رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔“

[اضافہ از مترجم: جمہور کی ایک قراءت کے مطابق ”لِلۡعٰلَمِیۡنَ“ (جمع عالَم: لام کے فتحہ کے ساتھ) پڑھا گیا ہے کہ اس میں نشانیاں ہیں تمام جہانوں کے لیے‘ یعنی جہان کے تمام لوگوں کے لیے۔ وہ اس طرح کہ پہلے زمین و آسمان کی خلقت کی طرف اشارہ کیا گیا اور پھر اس چیز کا ذکر کیا گیا جس کا تعلق خود زمین اور آسمان سے ہے‘ اور وہ ہے لوگوں کی زبانوں اور رنگوں کا اختلاف۔ تمام بنی آدم کی نسل ایک ہی ہے لیکن طوفانِ نوح کے بعد جب لوگ مختلف علاقوں میں پھیل گئے تو ایک ہی زبان کے لہجے مختلف ہوتے گئے اور پھر ہر لہجے نے ایک نئی زبان کی شکل اختیار کر لی۔ ایسے ہی ہر علاقے کے الگ الگ موسم کی وجہ سے انسان کی جلد پر بھی اثر پڑا اور رنگوں کا اختلاف واقع ہوا‘ اور پھر مختلف رنگوں کے جوڑوں سے نسلِ انسانی کے رنگ مزید تقسیم ہوتے گئے: اقتباس از ابن عاشور]

اب آیئے اگلی آیت کی طرف جس میں رات اور دن کی نشانی کو پیش کیا گیا ہے اور آخر میں کہا گیا کہ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سنتے ہیں (لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ ۞)۔ قرآن میں کئی جگہ دن اور رات کو خلقِ خدا کے لیے ایک چشمۂ رحمت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَجَعَلۡنَا الَّیۡلَ وَالنَّهَارَ اٰیَتَیۡنِ فَمَحَوۡنَاۤ اٰیَةَ الَّیۡلِ وَجَعَلۡنَاۤ اٰیَةَ النَّهَارِ مُبۡصِرَةً لِّتَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَلِتَعۡلَمُوۡا عَدَدَ السِّنِیۡنَ وَالۡحِسَابَ ؕ﴾ (الاسراء:۱۲)

”اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا تو رات کی نشانی کو بے نور بنا دیا اور دن کی نشانی کو روشن تاکہ تم اپنے رب کی طرف سے فضل تلاش کر سکو اور تاکہ تم سالوں کا شمار کر سکو اور حساب بھی رکھ سکو۔“

اور فرمایا:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ ﴾ (غافر : ۶۱)

''وہی اللہ ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تا کہ تم اس میں سکون حاصل کرسکو اور دن کو تمہارے لیے روشن بنادیا۔''

مزید فرمایا:

﴿ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ ﴾ (النبا)

''اور ہم نے رات کو پردہ بنادیا' اور دن کو روزگار۔''

ان تمام آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود رات اور دن میں اور جو کچھ ان دونوں اوقات میں ہوتا ہے' عبرت پذیری کے بہت سے سامان ہیں' اور اس کا ذریعہ سماعت یعنی ان احوال اور کیفیات کا سننا ہے جو دن رات سے متعلق ہیں' تو اس لیے آخر میں ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝ ﴾ لانا بالکل مناسب تھا۔

[اضافہ از مترجم: رات کو سونا اور دن کو کام کرنا لوگوں کے لیے ایک روزمرہ کی بات ہے اور اس میں جو حکمت کی باتیں پنہاں ہیں' لوگ اس کی حقیقت کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ انہیں بتایا نہ جائے۔ خاص طور پر رات کی نیند کہ جس کی وجہ سے دماغ کو سکون حاصل ہوتا ہے اور انسان جب اٹھتا ہے تو ایک دفعہ پھر اپنے آپ کو چست محسوس کرتا ہے اور دوبارہ کام کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

نیند کے دوران سوتے ہوئے شخص کے اردگرد بہت کچھ ہو جاتا ہے جس کا اسے خود کچھ علم نہیں ہوتا' بلکہ دوسرے لوگوں سے سن سنا کر اسے ساری باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے نیند کا لحاظ رکھتے ہوئے یہاں خاص طور پر کہا گیا کہ دن رات میں سننے والوں کے لیے نشانیاں ہیں: اقتباس از ابن عاشور]

اس سلسلے کی اگلی آیت میں آسمانی بجلی اور آسمان سے برسنے والی بارش کا ذکر ہے کہ جس کی بنا پر مردہ زمین لہلا اٹھتی ہے۔ آسمانی بجلی کچھ لوگوں کے لیے باعث خوف اور دوسروں کے لیے باعث امید رہتی ہے اور ایسے ہی مردہ زمین کا بارش کے پانی سے زندہ ہو جانا' یہ دونوں نشانیاں انہی لوگوں کے لیے عبرت پذیری کا سامان بنتی ہیں جو عقل سے کام لے کر کائنات کی گتھیوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس لیے آخر میں ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ ﴾ کہنا مناسب تھا۔

[اضافہ از مترجم: پچھلی آیت میں رات کی نیند اور دن کے کام کا حوالہ دیا گیا تھا جن کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے۔ اس آیت میں ان دو چیزوں کا بیان ہے جن کا تعلق خارجی مشاہدے سے ہے۔ آسمانی بجلی جب آسمان پر چمکتی ہے تو لوگ خوف سے تھرتھرا جاتے ہیں' کہ نہ جانے کس کے خرمن خاص کو بھسم کر کے رکھ دے' لیکن ایک کسان اسے بارش کی نوید سمجھتا ہے کہ وہ اپنی ساری امیدیں بارش سے لگائے بیٹھا ہے۔ وہ اس بات کو خوب جانتا ہے کہ آسمان سے پانی برسے گا تو مردہ زمین میں ہلچل پیدا ہو گی' اور پھر اس کا سوکھا ہوا خرمن فصل بہار کا منظر پیش کرے گا۔ یہ بات وہی سمجھ سکتا ہے جو عقل سلیم رکھتا ہو اور کسی دماغی خلل کا شکار نہ ہو: اقتباس از ابن عاشور]

(۲۸۸) آیت ۳۷

﴿ اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَقۡدِرُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۷﴾ ﴾

’’کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے رزق میں کشائش پیدا کر دیتا ہے اور (جس کے لیے چاہتا ہے) تنگی پیدا کر دیتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔‘‘

اور سورۃ الزمر میں ارشاد فرمایا:

﴿ اَوَلَمۡ یَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَقۡدِرُ ؕ ﴾ (الزمر: ۵۲)

’’کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے رزق میں کشائش اور (جس کے لیے چاہتا ہے رزق میں) تنگی پیدا کر دیتا ہے۔‘‘

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۃ الروم کی آیت میں ’’اَوَلَمۡ یَرَوۡا‘‘ کے الفاظ ہیں اور سورۃ الزمر میں ’’اَوَلَمۡ یَعۡلَمُوۡۤا‘‘ کے، تو اس فرق کی وجہ کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے (واللہ اعلم) کہ سورۃ الروم کی مذکورہ آیت سے قبل ارشاد ہوا:

﴿ اَوَلَمۡ یَتَفَکَّرُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ ۟ مَا خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ ﴾ (آیت ۸)

’’کیا وہ غور وفکر نہیں کرتے اپنی جانوں میں! اللہ تعالیٰ نے نہیں پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے مابین ہے مگر صرف اور صرف حق کی بنا پر اور ایک وقت معین تک کے لیے۔‘‘

اور:

﴿ اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ ﴾ (آیت ۹)

’’کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ وہ ان لوگوں کا انجام دیکھتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔‘‘

جب ایک شخص دوسرے سے یہ کہتا ہے: مَاذَا تَرٰی فِیۡ ھٰذَا الۡاَمۡرِ ’’تم اس معاملے میں کیا دیکھتے ہو؟ (کیا رائے رکھتے ہو)‘‘ تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ غور وفکر کے بعد مجھے بتاؤ کہ اس مسئلے میں تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟ اور ایسے ہی اگر کوئی شخص دوسرے سے یہ کہتا ہے: اِفۡعَلۡ فِیۡ ھٰذِہِ الۡقَضِیَّۃِ مَا اَرَاکَ اللّٰہُ ’’اس معاملے میں وہی کچھ کرو جو تمہیں اللہ دکھا دے‘‘ تو اس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ پہلے خوب غور وفکر کر لو اور جب کسی بات پر اطمینان ہو جائے تو اس پر عمل کر لو۔

گویا جہاں رؤیہ (مشاہدہ اور غور وفکر کے بعد رائے قائم کرنا) کا ذکر آیا ہے‘ وہاں خطا کا امکان رہتا ہے۔ زمین میں چلنا پھرنا اور پھر عبرت حاصل کرنا‘ ان دونوں کا تعلق مشاہدات سے ہے اور ساتھ ساتھ غور وفکر سے بھی۔ ہم چونکہ نبی اکرم ﷺ کی طرح معصوم نہیں ہیں‘ اس لیے ہم حاصل شدہ علم کو ظنِ غالب تو کہہ سکتے ہیں لیکن اسے قطعی علم نہیں قرار دے سکتے‘ برخلاف نبی ﷺ کے کہ انہیں کہا گیا: ﴿ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ ﴾ (المائدۃ: ۴۸) ’’اور ان کے درمیان فیصلہ کرو اس کے ساتھ جو اللہ نے نازل کیا ہے۔‘‘

نبی ﷺ پر وحی اترتی تھی، پھر وہ غلطی سے بھی معصوم رکھے گئے۔ خاص طور پر ان امور میں جن کا تعلق تبلیغِ دین اور شریعت کے احکام سے ہے۔ آپ ﷺ کا غور وفکر کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنا قطعی علم کے دائرے میں آتا ہے لیکن دوسرے کسی بھی شخص کا یہ مقام نہیں ہے۔ اس لیے ان کے لیے لفظ ''اَوَلَمۡ یَرَوۡا'' (کیا وہ نہیں دیکھتے) لانا مناسب تھا، کیونکہ یہ دونوں معانی (مشاہدہ اور غور وفکر) پر حاوی ہے اور موقع ومحل کی مناسبت سے اس کا کوئی بھی معنی لیا جا سکتا ہے۔ اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ سورۃ الروم میں مذکورہ آیت سے قبل ان دونوں معانی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ایک جگہ ''اَوَلَمۡ یَتَفَکَّرُوۡا'' اور دوسری جگہ ''اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ'' کہا گیا، جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں۔

جہاں تک سورۃ الزمر کا تعلق ہے تو وہاں ایسے کوئی الفاظ پہلے نہیں لائے گئے، اس لیے ''اَوَلَمۡ یَعۡلَمُوۡۤا'' سے بات کا آغاز کیا کہ یہاں تردّد کا کوئی موقع نہیں تھا اور نہ ہی اشتراکِ معنی کا، بلکہ جو بات پہلے کہی گئی وہ عبادت میں اخلاص سے متعلق تھی۔ فرمایا: ﴿فَاعۡبُدِ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ۲﴾ ''تو پھر اللہ کی عبادت کرو، اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔'' اور پھر ارشاد ہوا: ﴿قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ۱۱﴾ ''کہہ دیجیے: مجھے حکم ہوا ہے کہ مَیں اللہ کی عبادت کروں، اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔'' اخلاص خود علم کے ثمرات میں سے ہے، اس لیے یہاں ''اَوَلَمۡ یَعۡلَمُوۡۤا'' کہنا مناسب تھا۔ اس لیے کہ علم ہوگا تو اخلاص پیدا ہوگا۔

زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سبب یعنی علم کا بیان بعد میں ہوا اور اس سے قبل مسبّب (یعنی اخلاص) کا بیان اس کی اہمیت کی بنا پر پہلے ہو گیا۔ اس لحاظ سے دونوں آیات اپنی اپنی جگہ پر پوری مناسبت رکھتی ہیں۔ واللہ اعلم!

(۲۸۹) آیت ۴۳

﴿فَاَقِمۡ وَجۡہَکَ لِلدِّیۡنِ الۡقَیِّمِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا مَرَدَّ لَہٗ مِنَ اللّٰہِ یَوۡمَئِذٍ یَّصَّدَّعُوۡنَ ۴۳﴾

''پس اپنا رخ اس سیدھے اور سچے دین کی طرف رکھیں قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جو اللہ کی جانب سے ٹل نہیں سکتا، اس دن وہ سب علیحدہ علیحدہ ہو جائیں گے۔''

اور سورۃ الشوریٰ میں ارشاد فرمایا:

﴿اِسۡتَجِیۡبُوۡا لِرَبِّکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا مَرَدَّ لَہٗ مِنَ اللّٰہِ ؕ مَا لَکُمۡ مِّنۡ مَّلۡجَاٍ یَّوۡمَئِذٍ وَّ مَا لَکُمۡ مِّنۡ نَّکِیۡرٍ ۴۷﴾

''اپنے رب کا حکم مان لو قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جو اللہ کی طرف سے ٹلنے والا نہیں ہے۔ اس دن تمہارے لیے کوئی پناہ گاہ نہ ہوگی اور نہ ہی انکار کی گنجائش۔''

یہاں سوال کرنے والا یہ سوال کر سکتا ہے کہ دونوں آیتوں کا آخر میں اختلاف کیوں ہے، ایک میں کہا گیا: ﴿یَوۡمَئِذٍ یَّصَّدَّعُوۡنَ ۴۳﴾ اور دوسری میں کہا گیا: ﴿مَا لَکُمۡ مِّنۡ مَّلۡجَاٍ یَّوۡمَئِذٍ وَّ مَا لَکُمۡ مِّنۡ نَّکِیۡرٍ ۴۷﴾

اس کا جواب یہ ہے اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ سورۃ الروم (یَصَّدَّعُوْنَ) کی مناسبت سے بعد کی آیات میں بتایا گیا کہ وہ سب جدا جدا ہو جائیں گے تو پھر ان کے ساتھ کیا ہوگا۔ فرمایا:

﴿مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴿٤٤﴾﴾

''جس نے کفر کیا تو اس پر اس کے کفر کا وبال ہوگا' اور جس نے نیک کام کیے تو وہ اپنے (آرام) ہی کے لیے تیاری کر رہے ہوں گے۔''

یَصَّدَّعُوْنَ بمعنی ''یَتَفَرَّقُوْنَ'' ہے جو اسی سورت کی آیت ۱۴ میں بیان ہوا۔ فرمایا:

﴿وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿١٤﴾﴾

''اور جس دن قیامت کی گھڑی قائم ہوگی اس دن وہ سب علیحدہ علیحدہ ہو جائیں گے۔''

تو اس بات کا بیان ہو گیا کہ اس دن لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ کافروں کے اوپر ان کے کفر کا وبال ہوگا ﴿فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ﴾ اور اہلِ ایمان کا تو کیا کہنا کہ وہ اپنے نیک اعمال کی بنا پر جنت میں جانے کی تیاری کر رہے ہوں گے' یعنی جیسا عمل ویسی جزا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٦﴾﴾ (الطور)

''بے شک تمہیں وہی بدلہ دیا جائے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔''

تو واضح ہو گیا کہ سورۃ الروم کی آیت میں یہ لفظ (یَصَّدَّعُوْنَ) کیوں لایا گیا۔

اب آیئے سورۃ الشوریٰ کی آیت کی طرف' تو اس سے قبل ارشاد فرمایا تھا:

﴿وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ﴾ (الشوریٰ: ۴۴)

''اور جسے اللہ بہکا دے تو سوائے اللہ کے اس کے لیے کوئی اور چارہ ساز نہیں۔''

یہاں ''وَلِیّ'' کا لفظ لایا گیا جس سے مراد وہ ذات ہے کہ جس کی طرف انسان مدد اور چارہ گری کے لیے لوٹتا ہے' وہ ذات جس پر پورا اعتماد ہوتا ہے۔ اگلی آیت میں اسے اور کھول کر بیان کیا گیا ہے:

﴿وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ﴿٤٦﴾﴾

''اور ان کے لیے کوئی مددگار نہ ہوگا جو اللہ کے سوا ان کی مدد کر سکے۔ اور جسے اللہ بہکا دے تو اس کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہ ہوگا۔''

اب جبکہ ان کے علم میں آ گیا کہ اللہ کے سوا دوسرا کوئی مددگار نہ ہوگا اور نہ ہی اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ ہوگی تو مناسب تھا کہ انہیں کہا جاتا کہ اللہ ہی کی طرف پلٹو اس دن سے قبل جسے سوائے اللہ کے اور کوئی ٹال نہیں سکتا: ﴿اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ﴾ یعنی وہ دن ہر صورت آنے والا ہے اور اس دن سوائے اللہ کے اور کسی کے پاس پناہ نہ مل سکے گی: ﴿مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ﴾ یعنی کوئی تمہارا مددگار نہ ہوگا جو تمہاری طرف سے دفاع کر سکے اور تمہاری مدد کر سکے اور نہ ہی تم اپنی بداعمالیوں کا انکار کر سکو گے۔ اگر انکار کرو گے بھی تو تمہارے کچھ کام نہ آئے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ظالموں کے حال کا نقشہ کھینچا ہے کہ اُس دن وہ بھاگتے پھرتے ہوں گے لیکن کوئی ان کا مددگار نہ ہوگا' جن سے پہلے انہوں نے امید لگا رکھی تھی وہ بھی مدد نہ کر پائیں گے تو کیا ان کے لیے یہ بہتر نہیں کہ وہ اللہ سے لو لگا کر رکھیں' اُس کی راہ کو اپنائیں تاکہ اپنی نجات کا سامان بہم پہنچا سکیں۔ اس بیان کے ساتھ واضح ہو گیا کہ ہر دو آیات کے آخر میں جو الفاظ وارد ہوئے ہیں وہ اپنی اپنی جگہ بالکل مناسب ہیں۔

(۲۹۰) آیت ۴۶

﴿وَمِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنۡ یُّرۡسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِیُذِیۡقَکُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِہٖ وَلِتَجۡرِیَ الۡفُلۡکُ بِاَمۡرِہٖ وَلِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِہٖ﴾ (آیت ۴۶)

''اور اُس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ ہواؤں کو خوش خبری کے ساتھ بھیجتا ہے اور تاکہ تمہیں اپنی رحمت کا مزا بھی چکھا دے اور تاکہ کشتی بھی اس کے حکم سے چلتی رہے اور تاکہ تم اس کا فضل بھی تلاش کرتے رہو۔''

اور سورۃ الجاثیۃ میں ارشاد فرمایا:

﴿اَللّٰہُ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَکُمُ الۡبَحۡرَ لِتَجۡرِیَ الۡفُلۡکُ فِیۡہِ بِاَمۡرِہٖ وَلِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِہٖ﴾ (آیت ۱۲)

''وہی اللہ ہے جس نے سمندر کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ اس میں کشتی اس کے حکم سے چلتی رہے اور تاکہ تم اس کا فضل بھی تلاش کرتے رہو۔''

سوال یہ ہے کہ سورۃ الجاثیہ کی آیت میں ''فِیۡہِ'' (یعنی سمندر میں) کا اضافہ ہے لیکن سورۃ الروم کی آیت میں یہ ضمیر نہیں لائی گئی؟

جواباً عرض ہے کہ چونکہ سورۃ الروم میں سرے سے سمندر (الۡبَحۡر) کا ذکر ہی نہیں ہوا تو ضمیر کس طرف لوٹائی جاتی؟ اور اگر کشتی کے چلنے کی جگہ کا ذکر مقصود ہوتا تو لازمی طور پر ظاہری لفظ کو لایا جاتا یعنی (فِی الۡبَحۡرِ کا اضافہ) کیا جاتا۔ چونکہ یہ بات سیاق و سباق سے سمجھ آ رہی ہے' اس لیے اس کا ذکر کرنا چنداں ضروری نہ تھا۔ سورۃ الجاثیہ میں چونکہ ''الۡبَحۡر'' کا ذکر آ چکا تھا' اس لیے وہاں ''فِیۡہِ'' کہہ کر ضمیر کا لانا بالکل مناسب تھا۔ اسی فرق کی بنا پر ایک جگہ ضمیر لائی گئی اور دوسری جگہ اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر ''بیان القرآن'' کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں' آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی ونحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان مرحوم

سُورۃُ بَنِیۤ اِسۡرَآءِیۡل

آیات ۳۱ تا ۳۵

وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَکُمۡ خَشۡیَۃَ اِمۡلَاقٍ ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُہُمۡ وَاِیَّاکُمۡ ؕ اِنَّ قَتۡلَہُمۡ کَانَ خِطۡاً
کَبِیۡرًا ﴿۳۱﴾ وَلَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً ؕ وَسَآءَ سَبِیۡلًا ﴿۳۲﴾ وَلَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِیۡ
حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالۡحَقِّ ؕ وَمَنۡ قُتِلَ مَظۡلُوۡمًا فَقَدۡ جَعَلۡنَا لِوَلِیِّہٖ سُلۡطٰنًا فَلَا یُسۡرِفۡ فِّی الۡقَتۡلِ ؕ
اِنَّہٗ کَانَ مَنۡصُوۡرًا ﴿۳۳﴾ وَلَا تَقۡرَبُوۡا مَالَ الۡیَتِیۡمِ اِلَّا بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ حَتّٰی یَبۡلُغَ اَشُدَّہٗ ۪
وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَہۡدِ ۚ اِنَّ الۡعَہۡدَ کَانَ مَسۡـُٔوۡلًا ﴿۳۴﴾ وَاَوۡفُوا الۡکَیۡلَ اِذَا کِلۡتُمۡ وَزِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ
الۡمُسۡتَقِیۡمِ ؕ ذٰلِکَ خَیۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا ﴿۳۵﴾

ز ن ی

زَنٰی یَزۡنِیۡ (ض) زِنًی: زنا کرنا۔ ﴿وَلَا یَقۡتُلُوۡنَ النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَلَا یَزۡنُوۡنَ ۚ﴾ (الفرقان: ۶۸) ’’اور وہ لوگ قتل نہیں کرتے اس جان کو جسے محترم کیا اللہ نے مگر حق کے ساتھ اور وہ لوگ زنا نہیں کرتے۔‘‘

زِنًی (اسم ذات بھی ہے): زنا۔ زیر مطالعہ آیت ۳۲۔

زَانٍ (اسم فاعل): زنا کرنے والا۔ ﴿اَلزَّانِیۡ لَا یَنۡکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوۡ مُشۡرِکَۃً ۫ وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنۡکِحُہَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوۡ مُشۡرِکٌ ۚ﴾ (النور: ۳) ’’زانی مرد نکاح نہیں کرتا مگر زنا کرنے والی عورت سے یا شرک کرنے والی عورت سے‘ اور زنا کار عورت سے نکاح نہیں کرتا مگر زنا کرنے والا یا مشرک مرد۔‘‘

ترجمہ

وَلَا تَقْتُلُوْٓا : اور تم لوگ قتل مت کرو
اَوْلَادَكُمْ : اپنی اولاد کو
خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ : مفلس ہونے کے خوف سے
نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ : ہم ہی رزق دیتے ہیں ان کو
وَاِيَّاكُمْ : اور تم کو بھی
اِنَّ قَتْلَهُمْ : یقیناً ان کو قتل کرنا
كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا : ہے ایک بڑی غلطی
وَلَا تَقْرَبُوا : اور تم لوگ قریب مت ہو
الزِّنٰٓى : زنا کے
اِنَّهٗ كَانَ : یقیناً وہ ہے
فَاحِشَةً : ایک بے حیائی
وَسَآءَ سَبِيْلًا : اور برا ہے بلحاظ راستہ کے
وَلَا تَقْتُلُوا : اور تم لوگ قتل مت کرو
النَّفْسَ الَّتِيْ : اُس جان کو جس کو
حَرَّمَ اللّٰهُ : (قتل کرنا) حرام کیا اللہ نے
اِلَّا بِالْحَقِّ : مگر حق کے ساتھ
وَمَنْ قُتِلَ : اور جو قتل کیا گیا
مَظْلُوْمًا : مظلوم ہوتے ہوئے
فَقَدْ جَعَلْنَا : تو ہم نے بنا دیا ہے
لِوَلِيِّهٖ : اُس کے ولی کے لیے
سُلْطٰنًا : ایک اختیار
فَلَا يُسْرِفْ : تو اسے چاہیے کہ حد سے تجاوز نہ کرے
فِّي الْقَتْلِ : قتل کرنے میں
اِنَّهٗ كَانَ : بے شک وہ ہے
مَنْصُوْرًا : مدد کیا ہوا
وَلَا تَقْرَبُوْا : اور تم لوگ قریب مت ہو
مَالَ الْيَتِيْمِ : یتیم کے مال کے
اِلَّا بِالَّتِيْ : سوائے اس کے ساتھ جو کہ
هِيَ اَحْسَنُ : وہی سب سے بہتر ہو
حَتّٰى يَبْلُغَ : یہاں تک کہ وہ پہنچے
اَشُدَّهٗ : اپنی پختگی کو
وَاَوْفُوْا : اور تم لوگ پورا کرو
بِالْعَهْدِ : وعدے کو
اِنَّ الْعَهْدَ : یقیناً وعدہ
كَانَ مَسْئُوْلًا : ہے پوچھا جانے والا
وَاَوْفُوا : اور تم لوگ پورا کرو
الْكَيْلَ : ناپ کو
اِذَا كِلْتُمْ : جب بھی تم ناپو
وَزِنُوْا : اور تم لوگ وزن کرو
بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ : سیدھے ترازو سے
ذٰلِكَ خَيْرٌ : یہ سب سے بہتر ہے
وَّاَحْسَنُ : اور سب سے اچھا ہے
تَاْوِيْلًا : بلحاظ انجام کے

نوٹ ۱ : ترازو کے لیے عربی لفظ مِیْزَان ہے۔ قِسْطَاس کا معنی بھی ترازو ہے لیکن یہ عربی لفظ نہیں ہے۔ یہ یونانی لفظ ہے اور عرب تاجروں کے ذریعہ عرب میں بھی رائج ہو گیا۔ (حافظ احمد یار صاحب)

نوٹ ۲ : قتلِ نفس سے مراد صرف دوسرے انسان کا قتل ہی نہیں ہے' بلکہ خود اپنے آپ کو قتل کرنا بھی ہے۔ اس لیے کہ نفس' جس کو اللہ نے ذی حرمت قرار دیا ہے' اس کی تعریف میں دوسرے نفوس کی طرح انسان کا اپنا نفس بھی

داخل ہے۔ لہٰذا جتنا بڑا جرم اور گناہ قتلِ انسان ہے‘ اتنا ہی بڑا جرم اور گناہ خودکشی بھی ہے۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ ۳: اسلامی قانون میں قتل بالحق کی پانچ صورتیں ہیں: (۱) قتلِ عمد کے مجرم سے قصاص‘ (۲) دینِ حق کے راستے میں مزاحمت کرنے والوں سے جنگ‘ (۳) اسلامی نظامِ حکومت کو الٹنے کی سعی کرنے والوں کو سزا‘ (۴) شادی شدہ مرد یا عورت کو ارتکابِ زنا کی سزا‘ اور (۵) ارتداد کی سزا۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ ۴: ولی کے اختیار کا مطلب یہ ہے کہ وہ قصاص کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ اس سے اسلامی قانون کا یہ اصول نکلتا ہے کہ قتل کے مقدمے میں اصل مدعی حکومت نہیں بلکہ اولیائے مقتول ہیں۔ ان کو اختیار ہے کہ وہ قصاص میں قاتل کو قتل کروائیں یا خون بہا لینے پر راضی ہوں یا قاتل کو بالکل معاف کر دیں‘ البتہ قاتل کو سزا دینا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ مقتول کے اولیاء اور اس کے قبیلہ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ خود قاتل کو قتل کریں۔ اگر ان کو حکومت کی طرف سے قصاص لینے میں مدد نہیں ملتی تب بھی انہیں قاتل سے بدلہ لینے کی اجازت نہیں۔ اگر کوئی بدلہ لیتا ہے اور خود قاتل کو قتل کر دیتا ہے تو اب وہ خود قتلِ عمد کا مجرم اور گناہ گار ہے۔ ایسی صورت میں انہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا ہے اور فیصلہ اللہ پر چھوڑ دینا ہے۔ اس حکم پر عمل کرنے والے کو بے غیرت کہنا یا سمجھنا خود بھی ایک گناہ ہے۔

نوٹ ۵: اسراف فی القتل کی متعدد صورتیں ہیں۔ مثلاً اگر قاتل پر قابو نہ پا سکے تو اس کے خاندان یا قبیلے کے کسی فرد کو قتل کرنا‘ یا قاتل کے ساتھ اور لوگوں کو قتل کرنا‘ یا خون بہا لینے کے بعد پھر قتل کرنا‘ وغیرہ۔ یہ سب ممنوع ہیں اور گناہ ہیں۔

آیات ۳۶ تا ۴۰

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۶﴾ وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾ اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾

م ر ح

مَرِحَ يَمْرَحُ (س) مَرَحًا: ناز سے چلنا‘ اٹھلانا‘ اترانا۔ ﴿ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ﴿۷۵﴾﴾ (المؤمن) ”یہ اس سبب سے ہے جو تم لوگ خوش ہوتے تھے زمین میں حق کے بغیر اور اس سبب سے ہے جو تم لوگ اٹھلاتے تھے۔“ اور زیر مطالعہ آیت ۳۷۔

ترکیب

(آیت ۳۶) اَلسَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ یہ سب اِنَّ کے اسم ہیں۔ اس کے آگے پورا جملہ كُلُّ اُولٰٓئِكَ

كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ، اِنَّ کی خبر ہے۔اس جملہ میں کُلُّ اُولٰٓئِكَ مرکب اضافی كَانَ کا اسم ہے جبکہ مَسْـُٔوْلًا اس کی خبر ہے۔اس میں اِنَّ کے تینوں اسم یعنی اَلسَّمْعَ، اَلْبَصَرَ اور اَلْفُؤَادَ کی طرف اشارہ ہے‘اس لیے اسم اشارہ اُولٰٓئِكَ جمع کا صیغہ آیا ہے‘لیکن جمع کی ضمیر عَنْهُمْ کے بجائے واحد ضمیر عَنْهُ آئی ہے۔اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ہر ایک صلاحیت کے بارے میں الگ الگ پوچھا جائے گا۔(آیت ۳۷) مَرَحًا مصدر ہے اور حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہیں۔(آیت ۳۸) كُلُّ ذٰلِكَ مبتدأ ہے اور آگے کا پورا جملہ اس کی خبر ہے۔اس جملہ میں كَانَ کا اسم سَيِّئُهٗ ہے جبکہ مَكْرُوْهًا اس کی خبر ہے۔

ترجمہ

وَلَا تَقْفُ مَا : اور تُو پیچھے مت پڑ اُس کے

لَيْسَ لَكَ : نہیں ہے تیرے لیے (یعنی تیرے پاس)

بِهٖ عِلْمٌ : جس کا کوئی علم

اِنَّ السَّمْعَ : یقیناً سماعت

وَالْبَصَرَ : اور بصارت

وَالْفُؤَادَ : اور دل (یعنی تفقہ)

كُلُّ اُولٰٓئِكَ : ان کے سب ہیں (کہ)

كَانَ عَنْهُ : ہے اس (ہر ایک) کے بارے میں

مَسْـُٔوْلًا : پوچھا جانے والا

وَلَا تَمْشِ : اور تُو مت چل

فِي الْاَرْضِ : زمین میں

مَرَحًا : اتراتا ہوا

اِنَّكَ : یقیناً تُو

لَنْ تَخْرِقَ : ہرگز نہیں پھاڑ سکے گا

الْاَرْضَ : زمین کو

وَلَنْ تَبْلُغَ : اور تُو ہرگز نہیں پہنچ سکے گا

الْجِبَالَ : پہاڑوں کو

طُوْلًا : بلحاظ لمبائی کے

كُلُّ ذٰلِكَ : اس کا سب ہے (کہ)

كَانَ سَيِّئُهٗ : ہے اس (ہر ایک) کی برائی

عِنْدَ رَبِّكَ : آپؐ کے ربّ کے نزدیک

مَكْرُوْهًا : ناپسند کی ہوئی

ذٰلِكَ مِمَّآ : یہ اس میں سے ہے جو

اَوْحٰٓى اِلَيْكَ : وحی کیا آپؐ کی طرف

رَبُّكَ : آپؐ کے ربّ نے

مِنَ الْحِكْمَةِ : حکمت میں سے

وَلَا تَجْعَلْ : اور تُو مت بنا

مَعَ اللّٰهِ : اللہ کے ساتھ

اِلٰهًا اٰخَرَ : کوئی دوسرا الٰہ

فَتُلْقٰى : نتیجتاً تُو ڈالا جائے گا

فِيْ جَهَنَّمَ : جہنم میں

مَلُوْمًا : ملامت کیا ہوا ہوتے ہوئے

مَّدْحُوْرًا : ہانکا ہوا ہوتے ہوئے

اَفَاَصْفٰىكُمْ : تو کیا مخصوص کیا تم لوگوں کو

رَبُّكُمْ : تمہارے ربّ نے

بِالْبَنِيْنَ : بیٹوں کے ساتھ

وَاتَّخَذَ : اور (خود) اس نے بنائیں

مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ : فرشتوں میں سے

اِنَاثًا: بیٹیاں　　　　اِنَّکُمۡ لَتَقُوۡلُوۡنَ: بے شک تم لوگ یقیناً کہتے ہو

قَوۡلًا عَظِیۡمًا: ایک بڑی بات

نوٹ ۱: آیت ۳۶ میں لفظ ''عِلۡم'' اپنے اصطلاحی اور لغوی' دونوں مفہوموں کا جامع ہے۔ (ملاحظہ ہو: النحل:۵۶' نوٹ ۱) اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے عقائد اور نظریات کو اختیار نہ کرے جن کی سند قرآن وحدیث میں نہ ہو۔ زندگی کے معاملات میں جن اوامر اور نواہی کی سند قرآن وحدیث میں ہو ان کے خلاف نہ کرے۔ دیگر معاملات میں قابلِ اعتبار معلومات کے بغیر محض ظن اور گمان کی بنیاد پر نہ تو کوئی رائے قائم کرے اور نہ ہی کوئی فیصلہ یا اقدام کرے۔

نوٹ ۲: زندگی کے تمام معاملات میں کوئی رائے قائم کرنے یا فیصلہ کرنے کا جو process ہے' اس کی وضاحت الاعراف:۱۷۹' نوٹ ۲ میں کی جاچکی ہے' اس کو دوبارہ پڑھ لیں۔ زیر مطالعہ آیت ۳۶ میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ فیصلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں دے کر انسان کو دنیا کی امتحان گاہ میں بھیجا' ان کے متعلق پوچھا جائے گا کہ ان کو استعمال بھی کیا تھا یا محض اندھی تقلید پر ہی زندگی بسر کرتے رہے' اور اگر استعمال کیا تھا تو کس مقصد کے لیے استعمال کیا تھا؟

نوٹ ۳: آیت ۳۶ میں الفاظ آئے ہیں ''عَنۡهُ مَسۡـُٔوۡلًا''۔ بعض مترجمین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ کان' آنکھ اور دل سے پوچھا جائے گا لیکن استادِ محترم حافظ احمد یار صاحب کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سَاَلَ زَیۡدًا کا مطلب ہے: ''اُس نے زید سے پوچھا'' جبکہ سَاَلَ عَنۡ زَیۡدٍ کا مطلب ہے: ''اُس نے زید کے بارے میں پوچھا۔'' اس لحاظ سے مذکورہ الفاظ کا مطلب یہ بنتا ہے کہ مذکورہ صلاحیتوں سے نہیں بلکہ ان کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ ترجمہ میں اور اوپر نوٹ ۲ میں ہم نے حافظ صاحب رحمہ اللہ کی رائے کو اختیار کیا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے بھی اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''یقیناً سماعت' بصارت اور عقل سبھی کے بارے میں باز پرس کی جائے گی۔''

آیات ۴۱ تا ۴۴

وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِیۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لِیَذَّکَّرُوۡا ؕ وَمَا یَزِیۡدُهُمۡ اِلَّا نُفُوۡرًا ﴿۴۱﴾ قُلۡ لَّوۡ کَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ کَمَا یَقُوۡلُوۡنَ اِذًا لَّابۡتَغَوۡا اِلٰی ذِی الۡعَرۡشِ سَبِیۡلًا ﴿۴۲﴾ سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یَقُوۡلُوۡنَ عُلُوًّا کَبِیۡرًا ﴿۴۳﴾ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبۡعُ وَالۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِیۡهِنَّ ؕ وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ وَلٰکِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِیۡحَهُمۡ ؕ اِنَّهٗ کَانَ حَلِیۡمًا غَفُوۡرًا ﴿۴۴﴾

ترجمہ

وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا: اور بے شک ہم نے بار بار بیان کیا ہے (مضامین کو)　　　　فِیۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ: اس قرآن میں

لِيَذَّكَّرُوْا : تا کہ وہ لوگ نصیحت حاصل کریں | وَمَا يَزِيْدُهُمْ : اور وہ (یعنی قرآن) زیادہ نہیں کرتا ان کو
اِلَّا نُفُوْرًا : مگر بیزاریوں میں | قُلْ : آپؐ کہہ دیجیے
لَّوْ كَانَ : اگر ہوتے | مَعَهٗٓ : اس کے ساتھ
اٰلِهَةٌ : کچھ (دوسرے) اِلٰہ | كَمَا : جیسے کہ
يَقُوْلُوْنَ : وہ لوگ کہتے ہیں | اِذًا : تب تو
لَّابْتَغَوْا : وہ (دوسرے اِلٰہ) ضرور تلاش کرتے | اِلٰى ذِي الْعَرْشِ : عرش والے کی طرف
سَبِيْلًا : کوئی راستہ | سُبْحٰنَهٗ : پاکیزگی اس کی ہے
وَتَعٰلٰى : اور وہ بلند ہوا | عَمَّا : اس سے جو
يَقُوْلُوْنَ : وہ لوگ کہتے ہیں | عُلُوًّا كَبِيْرًا : جیسا بڑے بلند ہونے کا حق ہے
تُسَبِّحُ : تسبیح کرتے ہیں | لَهُ : اس کی
السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ : سات آسمان | وَالْاَرْضُ : اور زمین
وَمَنْ فِيْهِنَّ : اور وہ جو ان میں ہیں | وَاِنْ : اور نہیں ہے
مِّنْ شَيْءٍ : کوئی بھی چیز | اِلَّا : مگر (یہ کہ)
يُسَبِّحُ : وہ تسبیح کرتی ہے | بِحَمْدِهٖ : اُس کی حمد کے ساتھ
وَلٰكِنْ : اور لیکن | لَّا تَفْقَهُوْنَ : تم لوگ سمجھتے نہیں ہو
تَسْبِيْحَهُمْ : ان کی تسبیح کو | اِنَّهٗ كَانَ : بے شک وہ ہے
حَلِيْمًا : بُردبار | غَفُوْرًا : بے انتہا بخشنے والا

نوٹ: فرشتوں، انسانوں اور جنّوں کے علاوہ جو باقی چیزیں ہیں ان کی تسبیح کا کیا مطلب ہے؟ بعض علماء نے فرمایا کہ ان کی تسبیح سے مراد تسبیح حال ہے۔ یعنی ہر چیز کا مجموعی حال بتا رہا ہے کہ وہ اپنے وجود میں مستقل اور دائمی نہیں ہے بلکہ وہ کسی بڑی قدرت کے تابع چل رہا ہے۔ یہی شہادتِ حال اس کی تسبیح ہے۔ (اس میں اب یہ اضافہ بھی پڑھنے اور سننے میں آتا ہے کہ ہر چیز اپنے وجود سے گواہی دے رہی ہے کہ ان کا خالق ہر نقص اور عیب سے پاک ہے۔ یہ ان کی تسبیح ہے۔ مرتّب) مگر دوسرے اہلِ تحقیق کا قول یہ ہے کہ تسبیح اختیاری تو صرف فرشتوں اور مؤمن جنّ واِنس کے لیے مخصوص ہے، جبکہ تکوینی طور پر کائنات کا ذرّہ ذرّہ اللہ تعالیٰ کا تسبیح خواں ہے۔ قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ تم لوگ ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو، اس پر دلالت کرتا ہے کہ ذرّہ ذرّہ کی تسبیح کوئی ایسی چیز ہے جس کو عام انسان سمجھ نہیں سکتے، جبکہ تسبیح حالی کو تو اہلِ عقل وفہم سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ تسبیح صرف حالی نہیں بلکہ حقیقی بھی ہے مگر ہمارے فہم وادراک سے بالاتر ہے۔ امام قرطبی نے اسی کو راجح قرار دیا ہے اور اس پر قرآن و سُنّت کے بہت سے دلائل پیش کیے ہیں۔ (معارف القرآن سے ماخوذ)

آیات ۴۵ تا ۴۸

وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿٤٥﴾
وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ
وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿٤٦﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ
وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿٤٧﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا
لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿٤٨﴾

س ت ر

سَتَرَ يَسْتُرُ (ن) وَسَتَرَ يَسْتِرُ (ض) سَتْرًا : کسی چیز کو ڈھانکنا‘ چھپانا۔

سِتْرٌ (اسم ذات) : ہر وہ چیز جس سے کوئی چیز چھپائی جائے۔ اوٹ‘ آڑ۔ ﴿لَمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿٩٠﴾﴾ (الکہف) ’’ہم نے نہیں بنایا ان کے لیے اس سے کوئی آڑ۔‘‘

مَسْتُوْرٌ (اسم المفعول) : ڈھانکا ہوا‘ چھپایا ہوا۔ زیر مطالعہ آیت ۴۵۔

اِسْتَتَرَ (استفعال) اِسْتِتَارًا : ڈھکنا‘ چھپنا‘ پردہ کرنا۔ ﴿وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ﴾ (فُصِّلت:۲۲) ’’اور تم لوگ پردہ نہیں کرتے تھے۔‘‘

ترجمہ

وَإِذَا : اور جب بھی
قَرَأْتَ : آپ پڑھتے ہیں
الْقُرْاٰنَ : قرآن
جَعَلْنَا : تو ہم بنا دیتے ہیں
بَيْنَكَ : آپ کے درمیان
وَبَيْنَ الَّذِيْنَ : اور ان کے درمیان جو
لَا يُؤْمِنُوْنَ : ایمان نہیں لاتے
بِالْاٰخِرَةِ : آخرت پر
حِجَابًا مَّسْتُوْرًا : ایک چھپایا ہوا پردہ
وَّجَعَلْنَا : اور ہم ڈال دیتے ہیں
عَلٰى قُلُوْبِهِمْ : ان کے دلوں پر
اَكِنَّةً : کچھ غلاف
اَنْ : کہ (کہیں)
يَّفْقَهُوْهُ : وہ لوگ سمجھ لیں اس کو
وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ : اور ان کے کانوں میں
وَقْرًا : ایک بوجھ
وَاِذَا : اور جب بھی
ذَكَرْتَ : آپ ذکر کرتے ہیں
رَبَّكَ : اپنے ربّ کا
فِي الْقُرْاٰنِ : قرآن میں
وَحْدَهٗ : اس کے واحد ہونے کا
وَلَّوْا : تو وہ پھیر دیتے ہیں (خود کو)
عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ : اپنی پیٹھوں پر
نُفُوْرًا : بیزاریاں کرتے ہوئے
نَحْنُ اَعْلَمُ : ہم جانتے ہیں
بِمَا : اس کو

يَسْتَمِعُوْنَ : یہ لوگ غور سے سنتے ہیں | بِهٖٓ : جس کے سبب سے
اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ : جب یہ لوگ کان دھرتے ہیں | اِلَيْكَ : آپؐ کی طرف
وَاِذْ هُمْ : اور جب یہ لوگ | نَجْوٰٓى : سرگوشی کرتے ہیں
اِذْ يَقُوْلُ : جب کہتے ہیں | الظّٰلِمُوْنَ : یہ ظالم لوگ
اِنْ تَتَّبِعُوْنَ : نہیں پیروی کرتے تم لوگ | اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا : مگر ایک جادو کیے ہوئے شخص کی
اُنْظُرْ : آپؐ دیکھیں | كَيْفَ ضَرَبُوْا : کیسے انہوں نے بیان کیں
لَكَ الْاَمْثَالَ : آپؐ کے لیے مثالیں | فَضَلُّوْا : نتیجتاً وہ گمراہ ہوئے
فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ : پس وہ استطاعت نہیں رکھتے | سَبِيْلًا : کسی راستے کی

آیات ۴۹ تا ۵۲

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ
حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ
اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾
يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾

ر ف ت

رَفَتَ يَرْفُتُ (ن) رَفْتًا : کسی چیز کو توڑنا۔ کوٹنا۔

رُفَاتٌ : چورہ، ریزہ۔ زیر مطالعہ آیت ۴۹۔

ج د د

جَدَّ يَجِدُّ (ض) جِدَّةً : کسی چیز کا نیا ہونا۔

جَدًّا : کسی چیز کو کاٹنا۔ راستہ طے کرنا۔

جَدِيْدٌ : فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے بمعنی نیا۔ زیر مطالعہ آیت ۴۹۔

جُدَّةٌ (ج جُدَدٌ) طریقہ، راستہ۔ ﴿وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ﴾ (فاطر: ۲۷) ''اور پہاڑوں میں سے سفید راستے ہیں۔''

جَدَّ يَجَدُّ (س) جَدًّا : بزرگی اور عظمت والا ہونا۔

جَدٌّ : (اسم ذات بھی ہے) عظمت، بزرگی۔ ﴿وَاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا﴾ (الجن) ''اور یہ کہ بلند ہوئی ہمارے رب کی عظمت۔''

ن غ ض

نَغَضَ یَنْغُضُ (ن) وَنَغَضَ یَنْغِضُ (ض) نَغْضًا : کانپنا' ہلنا۔

اَنْغَضَ (افعال) اِنْغَاضًا : تعجب یا مسخری میں کوئی عضو ہلانا۔ جیسے ہاتھ نچانا' سر مٹکانا' وغیرہ۔ زیر مطالعہ آیت ۵۱۔

ترجمہ

وَقَالُوْٓا : اور انہوں نے کہا

ءَاِذَا كُنَّا : کیا جب ہم ہوں گے

عِظَامًا وَّرُفَاتًا : ہڈیاں اور چورہ

ءَاِنَّا : کیا ہم

لَمَبْعُوْثُوْنَ : ضرور اٹھائے جانے والے ہیں

خَلْقًا جَدِيْدًا : ایک نئی مخلوق ہوتے ہوئے

قُلْ كُوْنُوْا : آپؐ کہہ دیجیے تم ہو جاؤ

حِجَارَةً : کوئی پتھر

اَوْ حَدِيْدًا : یا کوئی لوہا

اَوْ خَلْقًا : یا کوئی مخلوق

مِّمَّا : اس میں سے جو

يَكْبُرُ : دشوار ہوتی ہے

فِيْ صُدُوْرِكُمْ : تمہارے سینوں میں (یعنی تمہاری سوچ میں' پھر بھی اٹھائے جاؤ گے)

فَسَيَقُوْلُوْنَ : پھر وہ کہیں گے

مَنْ يُّعِيْدُنَا : کون لوٹائے گا ہم کو؟

قُلِ الَّذِيْ : آپؐ کہہ دیجیے وہ جس نے

فَطَرَكُمْ : وجود بخشا تم کو

اَوَّلَ مَرَّةٍ : پہلی مرتبہ

فَسَيُنْغِضُوْنَ : پھر وہ لوگ مٹکائیں گے

اِلَيْكَ : آپؐ کی طرف

رُءُوْسَهُمْ : اپنے سروں کو

وَيَقُوْلُوْنَ : اور کہیں گے

مَتٰى هُوَ : کب وہ ہے (یعنی ہوگا)؟

قُلْ : آپؐ کہہ دیجیے

عَسٰٓى : ہوسکتا ہے

اَنْ يَّكُوْنَ : کہ وہ ہو

قَرِيْبًا : قریب ہی

يَوْمَ : جس دن

يَدْعُوْكُمْ : وہ پکارے گا تم لوگوں کو

فَتَسْتَجِيْبُوْنَ : پھر تم لوگ جواب دو گے

بِحَمْدِهٖ : اُس کی حمد کے ساتھ

وَتَظُنُّوْنَ : اور گمان کرو گے (کہ)

اِنْ لَّبِثْتُمْ : نہیں ٹھہرے تم

اِلَّا قَلِيْلًا : مگر تھوڑا (عرصہ)

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

نوجوان اور فتنہ ہائے عصر

ڈاکٹر محمد رشید ارشد ☆

یہ دنیا دار الامتحان ہے اور یہاں طرح طرح کے فتنوں اور آزمائشوں سے انسانوں کو جانچا جاتا ہے۔ بالخصوص عہدِ حاضر میں یہ فتنے نت نئے روپ میں سامنے آرہے ہیں اور آتے رہیں گے۔ ہماری نوجوان نسل کو ان فتنوں کے مقابلے کے لیے گزشتہ زمانے کے لوگوں سے کہیں زیادہ باخبر اور چوکنا رہنا ہوگا۔ اسی مناسبت سے یہ عنوان ''نوجوان اور فتنہ ہائے عصر'' اختیار کیا گیا ہے۔ سورۃ الملک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (آیت ۲)

''اللہ تعالیٰ نے موت و حیات کو خلق کیا تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ کون ہے جو عمل کے اعتبار سے زیادہ اچھا ہے۔''

حضرت فضیل بن عیاض سے پوچھا گیا: احسنِ عمل سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے فرمایا: ''عمل بالکل خالص اور صواب (نہایت درست) ہو۔'' سائل نے مزید وضاحت کے لیے درخواست کی تو فرمایا: ''خالص کا مطلب یہ ہے کہ عمل اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے اور صواب کا مطلب یہ ہے کہ عمل رسول اللہ ﷺ کی سُنّت کے مطابق ہو۔''

ہم جس دور میں رہتے ہیں اس میں غالب تہذیب مغربی تہذیب ہے اور ہر چیز کا معیار وہیں سے متعین ہوتا ہے۔ خوب و زشت کا، حسن و قبح کا، خیر و شر کا، صحیح و غلط کا معیار وہیں متعین ہوتا ہے۔ آیتِ مبارکہ کی اس تشریح سے ہمارے لیے بالکل واضح ہو گیا کہ جو بھی چمک دمک ہمیں مغرب میں نظر آتی ہے، نئے فیشنز ہیں، trends ہیں، وہ ''احسنِ عمل'' نہیں ہیں۔ احسنِ عمل وہ ہے جو اللہ کے لیے کیا جائے یعنی اس کی نیت باطنی سطح پر یہ ہو کہ اللہ کو خوش کرنا ہے، جبکہ ظاہری صورت یہ ہو کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے اسوہ کے مطابق ہو۔

یہاں تو بات کی گئی ہے ''فتنہ'' کے حوالے سے۔ مذکورہ بالا عنوان میں دو لفظ زیادہ اہمیت کے حامل ہیں: ''عصر'' اور ''نوجوان''۔ عصر کا مطلب ہے زمانہ یا وقت۔ ہر زمانے میں مشکلات اور آزمائشیں موجود رہی ہیں، لیکن دورِ حاضر کچھ ایسے نئے مسائل اور چیلنجز لے کر آیا ہے جو پہلے زمانوں میں نہیں تھے۔ یوں کہیے کہ فتنے تو ہمیشہ سے تھے، اب ان کی شکل اور انداز بدل گئے ہیں۔

دوسرا اہم لفظ ہے ''نوجوان''۔ انسان کی زندگی کے سب سے اہم اور طاقت وَر دور کو جوانی کہتے ہیں۔ یہ وہ عمر ہے جب انسان کے اندر جوش، ولولہ، توانائی اور کچھ کر گزرنے کی صلاحیت عروج پر ہوتی ہے۔ سورۃ الکہف میں

☆ اسلام آباد میں منعقدہ ایک سیمینار میں کی گئی گفتگو کی تسوید

ارشاد ہے:

﴿اِنَّھُمْ فِتْیَۃٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّھِمْ وَزِدْنٰھُمْ ھُدًی ﴿۱۳﴾﴾

''یہ کچھ نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے' تو ہم نے ان کو بڑھا دیا ان کی ہدایت میں۔''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں سورۃ الانبیاء میں ذکر آتا ہے کہ جب انہوں نے بتوں کو توڑ دیا اور یہ بات پھیلی کہ کسی نے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تو لوگ کہنے لگے:

﴿سَمِعْنَا فَتًی یَّذْکُرُھُمْ﴾ (آیت ۶۰)

''ہم نے ایک نوجوان کو سنا جو اِن بتوں کا ذکر کر رہا تھا۔''

پھر نوجوانی کا ایک نمونہ قرآنِ مجید میں سیدنا یوسف علیہ السلام کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ جس ابتلا میں وہ ڈالے گئے' وہ بہت بڑی آزمائش تھی۔ ترمذی شریف کی ایک حدیث سے اس آزمائش کی سنگینی اور اس میں ثبات کی فضیلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((سبعةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ تعالىٰ فِيْ ظِلِّه يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّه)) ''سات قسم کے افراد ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سائے میں جگہ دے گا' اُس دن جب اللہ کے عرش کے سائے کے سوا کوئی اور سایہ نہیں ہوگا۔'' ان میں ایک قسم یہ ہے: ((رَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذاتَ مَنْصَبٍ وَجمالٍ، فقال:إِنِّي أَخافُ اللّٰهَ)) ''ایک ایسا شخص جس کو بہت باوقار اور منصب والی' کسی اونچے خاندان کی خوب صورت عورت دعوتِ گناہ دے' اور وہ یہ کہے: ''میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں۔'' گویا قرآن نے بھی نوجوانوں کی استقامت کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اسی حدیث میں ایک اور قسم بھی ہے جس کا تعلق ہمارے عنوان سے ہے: ((شابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ اللّٰه)) ''وہ نوجوان جو اللہ کی بندگی ہی میں پروان چڑھا' اس کی تربیت اور پرورش اسی میں ہوئی۔''

اسی طرح ترمذی شریف کی ایک حدیث ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''بنی آدم کے قدم اُس وقت تک ربّ کے حضور سے ہل نہیں سکیں گے جب تک اس سے پانچ باتوں کا حساب نہ لے لیا جائے۔'' ان پانچ سوالات میں سے دو یہ ہیں: ((عَنْ عُمُرِهِ فِيمَ أَفْنَاهُ)) ''اس کی پوری زندگی کے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ کہاں فنا کی!'' ((وَعَنْ شَبَابِهِ فِيمَ أَبْلَاهُ)) ''اور اس کی جوانی کے بارے میں کہ کہاں خرچ کی؟'' یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ جب پہلے سوال میں عمر یعنی پوری زندگی کا ذکر ہو چکا' تو پھر جوانی کا الگ سے ذکر کیوں؟ یہ عطف الخاص علی العام کی ایک مثال ہے۔ یعنی پہلے عمومی بات کی گئی' پھر اسی کے ایک خاص حصے کو الگ سے بیان کر کے اس کی اہمیت کو نمایاں کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جوانی زندگی کا سب سے قیمتی اور نازک مرحلہ ہے' جس کے بارے میں الگ سے باز پُرس ہوگی۔

غالب تہذیب کا نفسیاتی وفکری رعب

عصرِ حاضر کے فتنوں کا بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر مغربی تہذیب کے پروردہ

ہیں۔ ’’مغربیت‘‘ محض ایک جغرافیائی اصطلاح نہیں۔ اس سے مراد وہ غالب نظامِ فکر ہے جس نے دنیا پر نہ صرف سیاسی و معاشی تسلط حاصل کیا‘ بلکہ علمی و نظریاتی میدان میں بھی اپنی بالادستی قائم کر لی ہے۔ انسانی نفسیات کا یہ خاصہ ہے کہ وہ قوت سے مرعوب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی تہذیب کا رعب صرف اس کی مادی طاقت کی وجہ سے نہیں‘ بلکہ اس کے سائنسی‘ تعلیمی اور فکری غلبے کے باعث نوجوانوں کے اعصاب پر سوار ہے۔

مشہور مورخ ابن خلدون نے اپنے شہرۂ آفاق ’’مقدمہ‘‘ میں اس عمرانی حقیقت کی تفصیل سے وضاحت کی ہے کہ: ’’مفتوح قومیں شعوری یا لاشعوری طور پر فاتح اقوام کی نقالی کرتی ہیں۔‘‘ وہ ان کے لباس‘ طرزِ معاشرت‘ زبان اور افکار کو اپنا کر ہی خود کو معتبر سمجھنے لگتی ہیں۔ عصر حاضر میں ہمارے نوجوانوں کا المیہ یہی ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے اسی سحر میں گرفتار ہو کر اپنی شناخت گم کر رہے ہیں۔

مغربی تہذیب کے ان گہرے اثرات کے نتیجے میں جن نمایاں فتنوں نے جنم لیا ہے‘ ان کی فہرست طویل ہے‘ البتہ درج ذیل سرفہرست ہیں:

* مسکرات و منشیات: نشہ و خمار کی مختلف صورتیں جو حواس کو معطل کر دیتی ہیں۔
* جنسی بے راہ روی: اخلاقی حدود کی پامالی اور صنفی انارکی
* فکری الحاد: دین سے بےزاری اور وجودِ باری تعالیٰ سے غفلت
* شعائرِ اسلام سے دوری: نماز اور دیگر فرائض و عبادات کی ادائیگی میں غفلت
* اباحیت پسندی: فحاشی‘ عریانی‘ موسیقی اور محض لذت پرستی کو زندگی کا مقصد بنالینا (Hedonism)

یہ فتنے بلاشبہ آج کے نوجوانوں کے لیے سنگین ترین چیلنجز ہیں۔ الحمدللہ‘ عہدِ حاضر کے بہت سے مصلحین اور اہلِ علم ان موضوعات پر مؤثر انداز میں آواز اٹھا رہے ہیں اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے کوشاں ہیں۔ تاہم‘ اس تحریر میں ہماری توجہ کا مرکز ان روایتی فتنوں سے ہٹ کر وہ پوشیدہ ذہنی‘ فکری اور معاشرتی الجھنیں ہیں جو بظاہر کھلم کھلا دینی یا اخلاقی فساد کی صورت میں تو نظر نہیں آتیں‘ مگر خاموشی سے انسان کے ایمان‘ اس کی خودی اور شخصیت کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں۔

جدید ’’ازمز‘‘ (Isms) اور فکری یلغار

عصرِ حاضر کے نوجوانوں کو درپیش فکری و تہذیبی چیلنجز کے تناظر میں یہ امر نہایت ضروری ہے کہ جدید ازمز (Isms) مثلاً لبرل ازم‘ مارکس ازم‘ ایگناسٹک ازم‘ ہیومن ازم اور کیپٹل ازم پر مدلّل گفتگو کی جائے۔ ان نظریات کی تفہیم اور تنقیدی جائزہ اس لیے ناگزیر ہے تاکہ ہماری نوجوان نسل ان کی ظاہری چمک دمک کے سحر میں مبتلا ہونے کے بجائے ان کی فکری جڑوں اور زہریلے اثرات سے شعوری طور پر باخبر ہو سکے۔ یہ تمام نظریات دراصل جدیدیت (Modernity) ہی کے مختلف روپ ہیں‘ جن کا بنیادی ہدف انسان کو تصورِ خدا‘ الہامی وحی اور آخرت کی جواب دہی کے احساس سے کاٹ کر محض مادی وجود تک محدود کر دینا ہے۔

آج کل ایک اصطلاح ’’فکری فیشن‘‘ کے طور پر بہت مقبول ہو رہی ہے‘ اور وہ ہے مسلم شناخت (Muslim Identity) کا تحفظ۔ یہ نعرہ ہر طرف گونج رہا ہے کہ مسلم نوجوان اپنی شناخت کھو رہے ہیں اور ہمیں اس کی بقا کی جنگ لڑنی ہے۔ بلاشبہ یہ تشویش درست اور حالات کا اہم تقاضا ہے‘ لیکن اس بحث کا ایک نہایت نازک پہلو وہ ہے جسے عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

نوجوانوں کے فکری فتنے

زیرِ نظر تحریر میں جس مسئلے کی نشان دہی کرنا مقصود ہے وہ ان نوجوانوں سے متعلق ہے جو بظاہر دینی رجحان رکھتے ہیں‘ جن کے چہرے پر داڑھی ہے‘ جو دینی مجالس میں شریک ہوتے ہیں‘ یا جو دینی اداروں سے وابستہ ہیں۔ جب ہم کسی فتنہ زدہ نوجوان کا تذکرہ کرنے لگتے ہیں تو عام طور پر یہ تصور ہی ذہن میں اُبھرآتا ہے کہ کوئی ایسا نوجوان ہے جو پھٹی ہوئی جینز پہنے ہوئے ہے‘ بالوں میں اسپائکس ہیں‘ کانوں میں بندے ہیں‘ اور ہاتھوں میں کڑے۔ بس یہی نوجوان فتنہ بن گیا ہے۔ درحقیقت خطرہ صرف یہی نہیں ہے۔ ایک نہایت نازک اور کم زیرِ بحث آنے والا فتنہ وہ ہے جو مذہبی ماحول کے اندر موجود ہے‘ اور وہ ہے ہمارے مذہبی نوجوانوں پر جدیدیت کا اثر۔ جدیدیت نے صرف یونیورسٹی‘ اسکول‘ کالج‘ یا میڈیا ہی کو متاثر نہیں کیا‘ بلکہ مذہبی طبقے‘ مذہبی فکر اور مذہبی حساسیت کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ یہ بات شاید کچھ لوگوں کو ناگوار گزرے‘ لیکن حقیقت یہی ہے کہ جدیدیت نے ہمارے دین کو سمجھنے کے انداز‘ اس کے بیان کے اسلوب‘ اور اس پر عمل کے اطوار کو بھی متاثر کیا ہے۔ مذہب ہمارے ذہن میں فرد کا ایک ذاتی مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ دین کا اجتماعی‘ تمدنی‘ سیاسی اور تہذیبی پہلو رفتہ رفتہ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ جدید فکر کے زیرِ اثر ہو رہا ہے‘ چاہے ہم اسے مانیں یا نہ مانیں۔ علامہ اقبال نے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے بارے میں جو سخت اور کڑوی مگر حقیقت پر مبنی باتیں کہیں‘ وہ آج بھی حیرت انگیز حد تک موزوں معلوم ہوتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ؎

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مُردہ ہے‘ مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفَس

اس کا تو سانس بھی اپنا نہیں ہے‘ یعنی بظاہر وہ زندہ ہے مگر فکری و روحانی طور پر مردہ ہے۔ اس کی سانسیں بھی مستعار ہیں۔ ایک اور مقام پر علامہ اقبال نے کہا: ؎

تیرا وجود سراپا تجلیٔ افرنگ
کہ تُو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

آج ہمارے ہاں جو طبقہ LUMS‘ IBA‘ NCA‘ BNU جیسے اداروں سے نکل کر معاشرے میں کردار ادا کر رہا ہے‘ وہ بڑی حد تک اسی مستعار شناخت (borrowed identit y) کا حامل ہے‘ جو اقبال کے ان اشعار کا عملی نمونہ بن چکا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس پر C.S.Lewis نے بھی ۱۹۳۰ء کی دہائی میں انگلی رکھی تھی۔ وہ اس

نظامِ تعلیم سے پیدا ہونے والی نسل کو trousered apes کہتا ہے‘ یعنی پتلون پہنے ہوئے بندر۔ بظاہر مہذب‘ مگر حقیقت میں فکری حیوانیت کا شکار۔ اس نسل کی ایک اور جھلک علامہ اقبال کے اس شعر میں دیکھی جا سکتی ہے: ؎

نوجوانان تشنہ لب‘ خالی ایاغ
شستہ رو‘ تاریک جان‘ روشن دماغ

ایک ایسا نوجوان جو چہرے سے صاف ستھرا‘ دماغ سے روشن‘ مگر دل سے تاریک اور روح سے پیاسا ہے۔ یہ وہی طبقہ ہے جس پر اکبرالٰہ آبادی نے طنز کا نشتر چلایا تھا: ؎

مشرق میں ولادت پر راضی نہ تھے یہ بندے
چارہ ہی مگر کیا تھا‘ فطرت جو یہاں جَن دے

یعنی یہ لوگ اپنی مشرقی شناخت پر شرمندہ ہیں‘ ان کی خواہش ہے کہ کاش وہ مغرب میں پیدا ہوتے۔ ایک اور موقع پر انہوں نے تہذیبی مرعوبیت اور خود فراموشی پر نہایت پُراثر طنز کرتے ہوئے کہا: ؎

اے خدا! مجھ کو کر دے صاحب لوگ — دور ہو مجھ سے اس جنم کا روگ
میرا قالب ہو قالبِ غربی — بھول جاؤں زبان بھی اپنی
رنگ چہرے کا میرے جائے بدل — کروں ایجاد میں بھی توپ و رَفل
سو کے اٹھوں جو آج صبح کو میں — لوگ سمجھیں کہ لاٹ صاحب ہیں

بحرانِ شخصیت: محض فیشن نہیں‘ فکری انخلا

اس پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ نسلِ نو کا اصل مسئلہ محض مغربی لباس پہننا یا ان کی موسیقی سے لطف اندوز ہونا نہیں ہے‘ بلکہ اس کا اصل بحران ’’تہذیبی بے چارگی‘‘ ہے۔ یہ نسل خود کو مغربی معیارِ تہذیب کی ترازو میں تولتی ہے اور ہر اس قدر کو حقیر سمجھتی ہے جس کا تعلق اس کی اپنی فکری‘ مذہبی اور روحانی جڑوں سے ہے۔ یہ فکری غلامی اسے ایک ایسے مقام پر لے آئی ہے جہاں وہ جسمانی طور پر تو موجود ہے‘ مگر اس کا دل اور دماغ مغرب کے ’’عمارت گروں‘‘ کی تعمیر کردہ عمارت کا ایک حصہ بن چکا ہے۔

یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ یہ نوجوان جن کے طرزِ فکر پر ہم تنقید کر رہے ہیں‘ ہمارے اپنے ہی بچے‘ اللہ کے بندے اور رسول اللہ ﷺ کے اُمتی ہیں۔ ان کے افکار سے اختلاف اپنی جگہ‘ مگر ہمارا رویہ نفرت کے بجائے سراسر خیر خواہی اور اصلاحِ احوال کے جذبے پر مبنی ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں سیدنا مسیح علیہ السلام کا وہ قول نہایت بصیرت افروز ہے جسے امام مالک نے ’’موطا‘‘ میں روایت کیا ہے:

وَلَا تَنْظُرُوْا فِي ذُنُوْبِ النَّاسِ كَأَنَّكُمْ أَرْبَابٌ، وَ انْظُرُوْا فِيْ ذُنُوْبِكُمْ كَأَنَّكُمْ عَبِيْدٌ،
فَإِنَّمَا النَّاسُ مُبْتَلًى وَ مُعَافًى، فَارْحَمُوْا أَهْلَ الْبَلَاءِ، وَ احْمَدُوا اللّٰهَ عَلَى الْعَافِيَةِ

(موطا مالک ۱/ ۷۵۱)

’’تم لوگوں کے گناہوں کو اس طرح نہ دیکھو گویا تم ان کے خدا (مالک) ہو‘ بلکہ اپنے گناہوں کو اس طرح دیکھو جیسے تم بندے ہو۔ لوگ صرف دو ہی طرح کے ہیں: یا عافیت میں ہیں یا آزمائش (ابتلا) میں۔ پس آزمائش میں مبتلا لوگوں پر رحم کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں عافیت عطا فرمائی۔‘‘

یہی وہ زاویۂ نگاہ ہے جو ہمیں اختیار کرنا چاہیے۔ ہماری تنقید میں دل کا درد اور زبان کی خیر خواہی شامل ہونی چاہیے‘ تاکہ یہ نسل مغربی سانچوں میں ڈھلنے کی آرزو ترک کر کے اپنی اصل شناخت کو پہچانے اور اس پر فخر کرنا سیکھے۔

وہ نوجوان جو دینی حلقوں کو فکری مغالطے (false consciousness) کا شکار سمجھ کر حقارت سے دیکھتے ہیں‘ ان کے جواب میں ہمیں خود کو خدائی منصب پر فائز نہیں کر لینا چاہیے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کی نصیحت ہمارے زُعمِ تقویٰ پر ایک کاری ضرب ہے: ’’خدا کی طرح نہ دیکھو‘ بندوں کی طرح دیکھو!‘‘

کائنات میں انسانی تقسیم کا اصل معیار مادی ترقی نہیں بلکہ ہدایت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی بندگی اور دین کی تھوڑی بہت توفیق عطا کی ہے‘ تو آپ ’’صاحبِ عافیت‘‘ ہیں‘ چاہے زندگی کتنی ہی پُرمشقت کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس جو لوگ اللہ سے دُور ہیں‘ وہ درحقیقت ’’اہلِ بلا‘‘ (آزمائش زدہ) ہیں‘ چاہے بظاہر ان کے حالات کتنے ہی روشن خیال اور ترقی یافتہ کیوں نہ لگیں۔ ہمارا فریضہ صرف یہ ہے:

((فَارْحَمُوْا أَهْلَ الْبَلَاءِ وَ احْمَدُوا اللّٰهَ عَلَى الْعَافِيَةِ))

’’اہلِ بلا پر رحم کرو اور اللہ کا شکر بجالاؤ کہ اس نے تمہیں عافیت دی۔‘‘

بندگی کی یہ توفیق اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے‘ نہ کہ ہماری اپنی کسی فضیلت کا نتیجہ۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا‘ یہ گفتگو ان فتنوں کے بارے میں ہے جو بظاہر نظر آتے ہیں۔ اس تناظر میں حکیم الامت علامہ اقبال کے یہ اشعار اس پوری صورت حال کو ایک نیا اور فکر انگیز زاویہ عطا کرتے ہیں: ؎

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ!

ہم یہ گمان رکھتے تھے کہ مذہبیت کی جو ایک نئی رو چل پڑی ہے‘ ایک دینی بیداری‘ رجوع الی اللہ‘ اس کے نتیجے میں بندگی میں اضافہ ہوگا‘ خیر عام ہوگا‘ اور معاشرہ اخلاقی طور پر سنورے گا۔ البتہ اب ہمیں محسوس ہو رہا ہے کہ اس کے ساتھ کچھ ناپسندیدہ پہلو بھی سامنے آ رہے ہیں‘ اور آج ہمیں انہی پر کچھ غور و فکر کرنا ہے۔ علامہ اقبال نے زندگی گزارنے کے دو منہج بیان کیے ہیں‘ جو ہمارے حالیہ منظرنامے کو سمجھنے میں بہت مدد دیتے ہیں۔ ایک منہج تو یہ ہے: ع ’’زمانہ با تو نہ سازد‘ تُو با زمانہ ساز!‘‘

علامہ اقبال اس منہج کی نفی کرتے ہوئے کہتے ہیں: ع

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز!

یعنی جو لوگ زندگی کے حقائق سے بے خبر ہیں یہ ان کا نظریہ ہے کہ اگر زمانہ تم سے سازگار نہیں' تو تم زمانے سے سمجھوتا کر لو۔ یہ پہلا رویہ ہے مطابقت' مفاہمت' اور بالآخر زمانے کے دھارے میں بہ جانے کا۔ دوسرا رویہ ہے:

زمانہ با تو نہ سازد' تو با زمانہ ستیز!

یعنی زمانہ تم سے موافقت نہ کرے تو اس سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ! الحمدللہ' آج لاکھوں ایسے نوجوان موجود ہیں جن کے دل میں مختلف شخصیات اور تحریکی افکار نے ''با زمانہ ستیز'' کی تڑپ اور دینی غیرت پیدا کر دی ہے۔ وہ مصلحت پسندی کے بجائے نظامِ باطل سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

مذہبی نوجوان اور اہلِ علم سے دوری: ایک نیا فتنہ

اسی بیداری کے بطن سے ایک تشویش ناک رجحان نے جنم لیا ہے' اور وہ ہے: ''علمائے کرام اور اہلِ مدارس سے بے زاری''۔ اس بے زاری کی کیفیت مختلف سطحوں پر موجود ہے؛ کہیں یہ محض لاتعلقی ہے' کہیں بدگمانی اور کہیں تحقیر و نفرت کا روپ دھار چکی ہے۔ یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ وہ نوجوان جو بظاہر دین کے لیے جاگا ہے' وہ اہلِ دین ہی سے نالاں ہے۔

بلاشبہ' علماء معصوم نہیں ہیں۔ زوال کے اس دور میں کوئی بھی طبقہ کمزوریوں سے مبرا نہیں رہا۔ علماء کے گروہ میں علمائے سوء کا وجود ایک ایسی حقیقت ہے جس سے صرف وہی شخص انکار کر سکتا ہے جو نصوصِ شرعیہ اور تاریخ سے ناواقف ہو۔ ہمیں خود بھی بحیثیت طالبِ علم علماء سے کئی علمی شکایات رہی ہیں' جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) **فرقہ واریت اور تکفیری مزاج:** علماء کا ایک بڑا حلقہ فقہی تعصبات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ معمولی علمی و فقہی اختلافات کو بنیاد بنا کر تکفیر کے فتوے جاری کرنا اور اسے ایمان و کفر کا مسئلہ بنا دینا' نوجوانوں کو دین سے نہیں تو دین داروں سے ضرور بدظن کر دیتا ہے۔

(۲) **عصرِ حاضر سے فکری دُوری:** یہ ایک جان دار اعتراض ہے کہ علماء کی اکثریت جدید دنیا کی حرکیات (dynamics) سے واقف نہیں۔ وہ سماجی' سیاسی اور عالمی منظرنامے کے فہم سے عاری ہو کر محض مساجد و مدارس تک محدود ہو گئے ہیں' جس کی وجہ سے نئی نسل کے پیچیدہ سوالات اور ان کی زبان سمجھنے سے قاصر ہیں۔

(۳) **اسلوبِ بیاں کی خشکی:** علماء کے خطاب میں اکثر وہ فکری گہرائی' ادبی حسن اور قلبی کشش مفقود ہوتی ہے جو جدید ذہن کو متاثر کر سکے۔ ان کا اسلوب روایتی اور خشک ہے' جو ترغیب کے بجائے بے زاری کا سبب بنتا ہے۔

(۴) **تصوّرِ دین کی محدودیت:** یہ تاثر عام ہے کہ علماء نے دین کو محض انفرادی عبادات اور خانقاہی مشقوں تک محدود کر دیا ہے۔ دین کا اجتماعی و سیاسی پہلو' اقامتِ دین' عدلِ اجتماعی اور معاشی اصلاح جیسے اہم موضوعات ان کے دائرۂ فکر سے خارج نظر آتے ہیں۔

تنقید اور تخریب کے درمیان حدِ فاصل

مذکورہ بالا چاروں نکات اپنی جگہ غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں' اور ان میں موجود صداقت سے انکار ممکن

نہیں۔ تاہم‘ اصل المیہ صرف ان خامیوں کا وجود نہیں ہے‘ بلکہ ان کی آڑ میں پورے طبقۂ علماء کی مسلسل تشہیری تذلیل (scandalization) ہے۔ یہ طرزِ فکر نوجوانوں کے اذہان میں دین کے خادموں کے خلاف ایسی نفرت اور بے زاری پیدا کر رہا ہے جو دینی بیداری (Islamic Revival) کے ثمرات کو ضائع کر سکتی ہے۔

ہمیں اب جذباتیت کے بجائے توازن اور عدل کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ علماء کی علمی یا عملی لغزشوں پر تنقید کرنا بلاشبہ ایک تعلیمی حق ہے‘ مگر اس تنقید کا ادب اور انصاف کے دائرے سے باہر نکل جانا فکری خودکشی کے مترادف ہے۔ ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ نقاد بننا نہایت سہل ہے‘ جبکہ مصلح اور خادم بننا کٹھن ترین عمل ہے۔ اصلاح کا راستہ نفرت اور تحقیر سے نہیں‘ بلکہ محبت‘ حکمت اور خالص خیر خواہی کے جذبے سے پھوٹتا ہے۔

اگر ہم نے علماء اور مدارس کے اداروں کو کُلّی طور پر منہدم کر دیا‘ تو ہمارے پاس دین کی حفاظت اور اس کی منتقلی کا کوئی دوسرا مستند متبادل موجود نہیں ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم خامیوں کی نشان دہی اس نیت سے کریں کہ اصلاح ہو‘ نہ کہ اس جذبے سے کہ انتشار پھیلے۔

نوجوانی کی سحر انگیزی: ایک نیا فکری فتنہ

عصرِ حاضر میں نوجوانوں کی فکری و عملی متحرک سازی (mobilization) کے دوران چند ایسے رجحانات ابھرے ہیں جنہیں ایک سنجیدہ مسئلے کے طور پر دیکھنا ناگزیر ہے۔ ان میں سب سے نمایاں رجحان وہ ہے جسے ہم ’’نوجوانی کی پوجا‘‘ (Worship of Youth) سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ آج کل یہ نعرہ بہت عام ہے کہ: ’’اب صرف نوجوان قیادت آنی چاہیے‘‘، ’’بزرگوں کا عہد تمام ہوا‘‘ یا ’’پرانی نسل کی باتیں فرسودہ ہو چکی ہیں۔‘‘

بظاہر پُرکشش نظر آنے والے یہ نعرے دراصل اس مغربی فکر کی پیداوار ہیں جہاں فرد پرستی‘ بے لگام آزادی اور ہر قسم کی روایتی قدغن سے بغاوت کو ایک ’’نظریہ‘‘ بنا دیا گیا ہے۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ یہ جذباتیت اب ہماری دینی و فکری تحریکوں میں بھی سرایت کر رہی ہے۔

اقبال کے کلام کی تعبیر اور فکری مغالطے

اس رجحان کو تقویت دینے کے لیے اکثر علامہ اقبال کا یہ مشہور شعر بطورِ دلیل پیش کیا جاتا ہے: ؎

خِرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا اُستاد کر!

ادبی لحاظ سے یہ شعر بلاشبہ بے پناہ تحریک آمیز ہے‘ مگر فکری اور عملی سطح پر اس کی درست تفہیم و تاویل نہایت ضروری ہے۔ اگر اس شعر کے ظاہری مفہوم کو بنیاد بنا کر تجربے کو جذبات کے تابع اور حکمت کو جوش کے نیچے دفن کر دیا جائے‘ تو یہ ایک غیر فطری اور خطرناک فکری الٹ پھیر ہوگا۔

قیادت: جوش اور ہوش کا توازن

حقیقت حال یہ ہے کہ نظامِ فطرت کے تحت پیروں (بزرگوں) کو ہی جوانوں کا استاد ہونا چاہیے۔ بزرگوں کا نچوڑا ہوا تجربہ‘ ان کی سرد و گرم چشیدہ دُور اندیشی اور فکری پختگی ہی وہ مینارۂ نور ہے جو نوجوانوں کے جوش و ولولے کو صحیح سمت عطا کرتا ہے۔ قیادت محض کسی خاص عمر کا نام نہیں‘ بلکہ یہ علم‘ تقویٰ‘ فہم اور بصیرت کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ صفات عموماً وقت کی بھٹی میں تپ کر ہی پختہ ہوتی ہیں۔ جوانوں کا جوش اگر بزرگوں کے ہوش کے ساتھ شامل نہ ہو‘ تو تحریکیں تعمیر کے بجائے تخریب کی راہ پر چل پڑتی ہیں۔

قرآنِ مجید نے عمر کے ساتھ حاصل ہونے والی نفسیاتی و عقلی بلوغت کو ایک آفاقی حقیقت کے طور پر بیان کیا ہے:

﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً﴾ (الاحقاف:۱۵)

’’یہاں تک کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچا‘ اور چالیس سال کی عمر کو پہنچ گیا۔‘‘

یہ آیت محض جسمانی نمو کی بات نہیں کرتی‘ بلکہ ایک مخصوص عقلی اور شعوری پختگی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کی سب سے بڑی ذمہ داری یعنی ’’نبوت‘‘ کے لیے‘ سوائے چند مستثنیات کے‘ چالیس سال کی عمر ہی کو معیار بنایا گیا۔ گویا وحیٔ الٰہی نے انسانی شخصیت کی تعمیر میں عمر اور تجربے کی اہمیت کو خود تسلیم کیا ہے۔

برکتِ اکابر اور نبوی اصولِ ادب

سماجی ترتیب اور باہمی احترام کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ایک بنیادی ضابطہ فراہم کرتا ہے:

((اَلْبَرَكَةُ مَعَ اَكَابِرِكُمْ)) (شعب الایمان)

’’برکت تمہارے بڑوں کے ساتھ ہے۔‘‘

یہاں اکابر سے مراد وہ شخصیات ہیں جو عمر‘ علم‘ فہم یا تقویٰ و عبادت میں فوقیت رکھتی ہوں۔ اسلام میں عمر کا تقدم بذاتِ خود ایک ایسی فضیلت ہے جو توقیر کی مستحق ہے۔ اس باب میں نبی کریم ﷺ کا فیصلہ کن ارشاد ملاحظہ ہو:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَيَعْرِفْ شَرَفَ كَبِيْرِنَا)) (سنن الترمذی)

’’وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی عزت (اور ان کے حق کو) نہ پہچانے۔‘‘

دوسری روایت میں ہے:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَيُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا)) (صحیح الجامع: ۵۴۴۵)

’’وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کا احترام نہ کرے۔‘‘

ایک اور روایت میں ہے:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا، وَ يَعْرِفْ حَقَّ كَبِيْرِنَا)) (مسند احمد)

’’وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے‘ اور جو ہمارے بڑوں کے حق کو نہ پہچانے۔‘‘

علمی تسلسل اور اصاغر کا فتنہ

ادب کا یہ تقاضا صرف عمر تک محدود نہیں بلکہ علم کے میدان میں اس کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

((لَا یَزَالُ النَّاسُ بِخَیْرٍ مَا أَخَذُوا الْعِلْمَ عَنْ أَکَابِرِھِمْ وَعَنْ أُمَنَائِھِمْ وَعُلَمَائِھِمْ، فَإِذَا أَخَذُوہُ مِنْ أَصَاغِرِھِمْ وَشِرَارِھِمْ ھَلَکُوا)) (المدخل الی السنن الکبریٰ)

''لوگ اس وقت تک خیر پر رہیں گے جب تک وہ اپنا علم اکابر اور معتبر علما سے حاصل کرتے رہیں گے، لیکن جب وہ اصاغر (کم علم اور ناتجربہ کار) اور فتنہ انگیزوں کی طرف رجوع کریں گے تو ہلاکت ان کا مقدر بن جائے گی۔''

آج ہم معلومات کے ایک ایسے سیلاب میں گھرے ہوئے ہیں جہاں علم کا اعتماد اور نسبت مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ یوٹیوب اور سوشل میڈیا پر ایسے افراد نمودار ہو چکے ہیں جن کا نہ کوئی علمی پس منظر ہے اور نہ ہی کوئی معتبر شجرۂ علم۔ وہ محض اپنی چرب زبانی، دیدہ زیب ویڈیوز اور انگریزی اصطلاحات کے سہارے ایک فکری برانڈ قائم کر لیتے ہیں۔ نوجوان نسل ان کی ظاہری کشش سے مرعوب ہو کر ان کی شخصیت کی اسیر ہو جاتی ہے، حالانکہ وہ علم نہیں بلکہ محض ایک تاثر (impression) بیچ رہے ہوتے ہیں۔

علم کی نسبت: کیا کہا اور کس نے کہا؟

دینِ اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ علم کے حصول میں صرف بات اہم نہیں ہوتی بلکہ بات کہنے والے کی ثقاہت بھی ناگزیر ہے۔ امام عبداللہ بن مبارکؒ کا قول اس سلسلے میں مشعلِ راہ ہے:

فَأَمَّا صَغِیرٌ یَرْوِي عَنْ کَبِیرٍ فَلَیْسَ بِصَغِیرٍ

''جو چھوٹا اپنے بڑوں سے جوڑتا ہے، وہ چھوٹا نہیں (وہ بڑا ہے)۔''

اس سے یہ سنہری اصول وضع ہوتا ہے کہ اگر کوئی نوجوان علم کے تسلسل سے جڑا ہے، اپنے اسلاف اور اکابر کا احترام کرتا ہے اور ان کے منہجِ علم پر گامزن ہے، تو وہ علمی وزن کے اعتبار سے بڑا ہی تسلیم کیا جائے گا، چاہے وہ عمر کے لحاظ سے نوجوان ہی کیوں نہ ہو۔

نفسِ علم اور مرکزیتِ ذات کا دھوکا

اگر کوئی نوجوان محض اپنے مطالعہ کی وسعت یا معلومات کی بہتات کی بنا پر خود کو ''مرکزِ علم'' گمان کرنے لگے اور اپنے سے بڑوں، مشائخ اور مصلحین کی ناقدری (discredit) شروع کر دے، تو وہ درحقیقت خود کو بھی فکری ہلاکت میں ڈال رہا ہے اور دوسروں کی گمراہی کا سامان بھی کر رہا ہے۔ سیدنا عمر بن خطابؓ کا قول اس ضمن میں نہایت بصیرت افروز ہے:

"أَلَا وَإِنَّ النَّاسَ بِخَيْرٍ مَا أَخَذُوا الْعِلْمَ عَنْ أَكَابِرِهِمْ، وَلَمْ يَقُمِ الصَّغِيرُ عَلَى الْكَبِيرِ، فَإِذَا قَامَ الصَّغِيرُ عَلَى الْكَبِيرِ فَقَدْ هَلَكُوا" (شرح اصول اعتقاد اهل السنة للالکائی)

"خبردار! لوگ بھلائی پر رہیں گے جب تک علم کو اپنے بڑوں سے لیتے رہیں۔ اور جب چھوٹے' ناتجربہ کار یا کم علم' بڑے اہلِ علم پر غالب آ جائیں' تو وہ ہلاک ہو جائیں گے۔"

یہ ایک سنہری اصول ہے کہ نظامِ حیات تبھی متوازن رہتا ہے جب بڑے چھوٹوں کی تربیت و نگرانی کریں' نہ کہ چھوٹے اپنے تئیں بڑوں کے نگران اور منصف بن بیٹھیں۔

جوانی کی پوجا: ایک درآمد شدہ فکری بیماری

آج کل نوجوانی کا حد سے زیادہ ڈھول پیٹنا اور عمر رسیدہ یا تجربہ کار طبقے کو بوجھ یا فرسودہ سمجھنا ایک فکری مرض کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ یہ اسلامی فکر کا حصہ نہیں' بلکہ مغربی معاشروں کی پیدا کردہ وہ عمر پرستی (Ageism) ہے جہاں مادی افادیت ہی سب کچھ ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے اسی فکری بگاڑ کی نشان دہی اُس وقت کی تھی جب انگریزی تہذیب کا غلبہ اپنی جڑیں جما رہا تھا:

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اکبر کا یہ طنز دراصل اُس نظامِ تعلیم پر تھا جس نے نئی نسل کو اپنے ماضی اور اپنے بزرگوں سے بیگانہ کر کے انہیں ایک مصنوعی "روشن خیالی" کے سراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان کے نزدیک مغرب زدہ تعلیم یافتہ نوجوان اپنے بڑوں کو صرف اس لیے حقیر جانتا ہے کہ وہ جدید اصطلاحات سے ناواقف ہیں۔ اکبر ہی کا ایک شعر ہے:

بوڑھوں نے پہلے لڑکوں کو خود ہی بنایا کھیل
ان کی نظر میں آپ ہی اب کھیل ہو گئے

اکبر نے علی گڑھ تحریک کے دور میں جب یہ دیکھا کہ تعلیم کا مقصد صرف نوکری اور مادی ترقی رہ گیا ہے' تو انہوں نے اسے "معزز پیٹ" کا نام دیا۔ جب کسی قوم کی تعلیم کا قبلہ روٹی بن جائے' تو وہی اخلاقی انحطاط جنم لیتا ہے جو آج ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔ جدیدیت کی اس لہر نے نسلوں کے درمیان ادب اور احترام کے رشتوں کو جس طرح پامال کیا' اکبر نے اس پر نہایت کرب کے ساتھ کہا:

تعلیم ہے لڑکوں کی کہ اک دامِ بلا ہے
اے کاش کہ اس عہد میں ہم باپ نہ ہوتے!

یہ شعر اس تہذیبی بے چارگی کی انتہا ہے جہاں باپ اپنی ہی اولاد کے ہاتھوں فکری طور پر ذلیل و خوار ہوتا نظر آتا ہے۔

جدید تعلیمی نظام: تربیت گاہ یا قتل گاہ؟

موجودہ تعلیمی ڈھانچا ایک ایسی آفت بن چکا ہے جس کی آغوش سے فتنہ اور فکری بے راہ روی جنم لے رہی

ہے۔ آج ایک باشعور والد کے لیے سب سے بڑی آزمائش یہ ہے کہ اسے اپنی اولاد کو ایک ایسے نظام کے سپرد کرنا پڑتا ہے جس پر اسے خود بھی اعتماد نہیں۔ یہ محض ایک تعلیمی انتخاب نہیں‘ بلکہ ایک وجودی مسئلہ ہے کہ ان معصوم ذہنوں کو کن کے حوالے کیا جائے! اکبرالٰہ آبادی نے اسی تلخ حقیقت کو نہایت سفاکی سے بیان کیا تھا: ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

گلی محلوں میں غیر ملکی زبان اور انگریزی ناموں کے ساتھ کھلے یہ تعلیمی ادارے درحقیقت وہ مقتل ہیں جہاں نئی نسل کے ایمان اور تہذیبی تشخص کو بڑی بے دردی سے ذبح کیا جا رہا ہے۔ لوگ پریشان ہیں کہ وہ اپنے بچوں کے مستقبل اور ایمان کے درمیان توازن کیسے قائم کریں۔

ایک بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ جوانی کی بے لگام پرستش اور بزرگوں کی تحقیر کا رویہ سراسر غیر دینی ہے۔ یہ فکری بیماری اب صرف سیکولر طبقے تک محدود نہیں رہی‘ بلکہ ان نوجوانوں میں بھی سرایت کر رہی ہے جو بظاہر مذہبی رجحان رکھتے ہیں۔ خاص طور پر تکنیکی ماہرین (technocrats) کا وہ طبقہ جو مختلف پیشہ ورانہ شعبوں جیسے MBA‘ انجینئرنگ اور میڈیکل سائنسز‘ یا اکاؤنٹنگ وغیرہ میں تعلیم حاصل کر رہا ہے‘ اس مرض کا زیادہ شکار نظر آتا ہے۔ یہ نوجوان بظاہر بہت سمجھ دار‘ سلجھے ہوئے اور جدید دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں‘ لیکن ان کی مذہبیت اکثر و بیشتر ان کے پیشہ ورانہ تکبر اور جدید فکری برتری کے نیچے دبی ہوتی ہے۔ وہ جدید علوم کی مہارت کو معیار بنا کر دینی اکابر کے تجربے اور روایت کو کم تر سمجھنے کی فکری غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

تخلیق نو بمقابلہ استناد: ڈیجیٹل دور کا فکری بحران

عصرِ حاضر کا ایک نمایاں فکری تضاد انفراد بمقابلہ استناد (Authenticity vs. Novelty) کی کشمکش ہے۔ آج کا دور جدت پسندی کا دَور ہے‘ جہاں ہر شخص کچھ نیا کہنے‘ کچھ اچھوتا دکھانے اور ایک منفرد نقطۂ نظر پیش کرنے کی دوڑ میں مگن ہے۔ خاص طور پر اگر آپ کا تعلق مذہبی شوبز (religious showbiz) سے ہے اور آپ اس میں اپنا مقام بنانا چاہتے ہیں‘ تو سادہ اور روایتی اسلوبِ بیاں اب قاری یا سامع کو متاثر کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اس بازارِ سیاست و ہوس میں کامیابی کے لیے چونکا دینے والے زاویے اور غیر معمولی اختراعات ناگزیر ہو چکی ہیں تاکہ عوام کی توجہ حاصل کی جا سکے اور ویوز (views) کی تعداد میں اضافہ ہو۔ برسوں پہلے ایک مشہور کتاب آئی تھی: Metaphors We Live By‘ جس کا لبِ لُباب یہ تھا کہ انسانی زندگی کچھ مخصوص استعاروں کے گرد گھومتی ہے۔ آج کی صورت حال اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہو چکی ہے۔ آج یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم Algorithms We Live By کے عہد میں جی رہے ہیں۔ ہماری ترجیحات‘ مشاہدات‘ یہاں تک کہ ذوقِ انتخاب بھی اعداد و شمار کے تابع ہو چکا ہے۔

آج کسی مذہبی اسکالر کی علمی ثقاہت کا فیصلہ اس کے ڈیجیٹل فٹ پرنٹ سے ہوتا ہے۔ اگر کسی ویڈیو کے ویوز

کم ہوں‘ تو جدید ذہن فوراً اسے غیر اہم یا بوریت کا درجہ دے کر مسترد کر دیتا ہے۔ اب معیار علم یا روحانیت نہیں رہا‘ بلکہ یہ طے پایا ہے کہ مواد (content) جاذبِ نظر اور تفریحی (entertaining) ہونا چاہیے۔ گانا ہو یا مذہبی بیان‘ اس کی قدر و قیمت کا تعین علم کے بجائے اس کے نیچے درج اعداد و شمار (numbers) کرتے ہیں۔ اس کے برعکس‘ دین ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ علم حاصل کرنے سے پہلے ماخذِ علم (source) پر نظر رکھی جائے۔ کلام کی حقیقی معنویت اس کے قائل (کہنے والے) سے کشید کی جاتی ہے۔ قرآنِ مجید کی سب سے بڑی عظمت یہی ہے کہ یہ ’’اللہ کا کلام‘‘ ہے۔

اگر کوئی جملہ بظاہر سادہ یا فہم سے بالاتر محسوس ہو‘ تو عام حالات میں انسان اسے نظر انداز کر سکتا ہے‘ لیکن جیسے ہی یہ انکشاف ہوتا ہے کہ یہ ’’قرآن کی آیت‘‘ ہے‘ تو مومن کی کیفیات یکسر بدل جاتی ہیں۔ وہ لرز اٹھتا ہے اور اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے کلامِ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔ یہ رویہ اس بات کی علامت ہے کہ دین میں ’’کون کہہ رہا ہے‘‘ کی اہمیت ’’کیا کہا جا رہا ہے‘‘ سے کہیں زیادہ ہے۔ کلام کی تفہیم اور اس کی قدر و قیمت کا انحصار بڑی حد تک قائل کی شخصیت اور اس کے علمی مرتبے پر ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو ایک مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی محفل میں ایک شعر پڑھا جائے اور حاضرین اس کی معرفت پر سر دھنیں‘ لیکن بعد میں انکشاف ہو کہ وہ شعر جدید دور کے کسی سطحی شاعر کا ہے‘ تو ایک باذوق شخص فوراً اپنی حسِ لطافت پر نادم ہوتا ہے کہ اس نے ایک عام سی بات میں گہرائی کیوں تلاش کی۔ اس کے برعکس‘ اگر کسی شعر کو پہلی نظر میں کمزور سمجھ کر مسترد کر دیا جائے‘ لیکن پھر بتایا جائے کہ یہ ’’خدائے سخن‘‘ میر تقی میر کا کلام ہے‘ تو قاری فوراً اپنی رائے سے رجوع کر لیتا ہے۔ وہ اپنی فہم پر شک کرتا ہے کہ اگر میر نے یہ بات کہی ہے تو یقیناً اس میں کوئی پوشیدہ نکتہ یا فنی باریکی ہوگی جو میری نظر سے اوجھل رہی۔ گویا قائل کی سند اور اس کا مرتبہ کلام کو وہ وزن عطا کرتا ہے جو الفاظ کے لغوی مفہوم سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

سند اور دینی روایت کا تسلسل

دینِ اسلام میں اس نظریے کی مکمل جھلک سلسلۂ اسناد میں نظر آتی ہے۔ احادیثِ مبارکہ کی حفاظت کے لیے محدّثین نے جو نظام وضع کیا‘ اس کی بنیاد اسی پر ہے کہ علم ’’کس سے‘‘ حاصل کیا جا رہا ہے۔ ایک طالبِ علم اپنے استاد سے اور وہ اپنے استاد سے روایت کرتا ہے‘ یہاں تک کہ یہ نورانی سلسلہ براہِ راست نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس تک جا پہنچتا ہے۔ یہ دینی روایت محض معلومات کی منتقلی کا نام نہیں‘ بلکہ ایک ایسا زندۂ جاوید تسلسل ہے جو علم کو وقار اور ثقاہت (authenticity) عطا کرتا ہے۔ پڑھنے والا ہو یا پڑھانے والا‘ دونوں خود کو ایک عظیم الشان علمی روایت کا حصہ سمجھتے ہیں۔ اس احساسِ نسبت کو اکبر الٰہ آبادی نے ایک خوب صورت تمثیل میں پرو دیا ہے: ؎

اک برگِ گل کہے گا کہ ہم گل کے جُزو ہیں
تم خود کو کیا کہو گے کہ کس کُل کے جُزو ہیں!

یہ شعر اس فکری بحران کی طرف اشارہ ہے جہاں آج کا انسان اپنی جڑوں اور اپنی اصل (الکُل) سے کٹ

کر تنہا رہ گیا ہے۔ جب تک ایک پتی (برگِ گل) پھول سے جڑی ہے‘ وہ معتبر ہے؛ اسی طرح جب تک ایک فرد اپنی علمی و دینی روایت سے جڑا ہے‘ اس کا وجود معنی خیز ہے۔

تحریک و حرکت کا فتنہ اور احتیاط کی حکمت

عصرِ حاضر میں ایک مخصوص طرزِ گفتگو نہایت مقبول ہو چکا ہے‘ جس کا محور محض ’’اُٹھو‘ جاگو اور کام کرو‘‘ جیسے نعرے ہیں۔ مذہبی جماعتوں اور روایتی علمی مراکز کی مبینہ ناکامی کا ڈھنڈورا پیٹ کر نوجوانوں کو مسلسل تحریک‘ فعالیت (activism) اور مہم جوئی پر اکسایا جا رہا ہے‘ گویا اس ہنگامہ آرائی سے پیچھے رہنا کوئی گناہِ کبیرہ ہو۔ حقیقتِ دین یہ ہے کہ ہر زمانہ اور ہر مسئلہ صرف حرکت کا متقاضی نہیں ہوتا۔ بعض حالات میں سکون‘ خاموشی اور کنارہ کشی (retreat) ہی سب سے بڑی دانش مندی ہوتی ہے۔ دین ہمیں سکھاتا ہے کہ فتنوں کے دور میں بعض اوقات بے عمل رہنا یا کسی تحریک کا حصہ نہ بننا ہی سب سے بڑی حکمت ہے۔ رسول اللہﷺ نے ایک ایسے فتنے کی خبر دی ہے جس میں دوڑنے والے سے چلنے والا‘ اور چلنے والے سے کھڑا رہنے والا بہتر ہوگا‘ یہاں تک کہ اگر کھڑا رہنے والا بھی خطرہ محسوس کرے تو وہ بیٹھ جائے یا لیٹ جائے۔ اس کا مفہوم واضح ہے کہ فتنوں کے ہیجان میں نجات کی راہ عمل میں نہیں بلکہ احتیاط اور تحفظ میں پوشیدہ ہے۔ ’’الترغیب و الترھیب‘‘ کی ایک روایت میں ارشاد ہے: ((كُونُوا أَحْلَاسَ بُيُوتِكُمْ)) ’’اپنے گھروں کے کونے کا ٹاٹ بن جاؤ‘‘۔ یہ طرزِ عمل کسی فرار یا بزدلی کا نام نہیں‘ بلکہ ایک گہرے فکری اور روحانی تدبر کا ثمر ہے۔

جدید مغربی انسان مسلسل ایک مضطرب وجود (agitative self) کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ وہ ہر وقت ردِعمل‘ احتجاج اور کسی نہ کسی نئی مہم کا حصہ بننے پر مجبور ہے۔ اس کے برعکس‘ اللہ کے اولیاء کی زندگی میں سکون‘ توازن اور وقار پایا جاتا ہے۔ وہ شور کے بجائے سکوت میں جیتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی حق و باطل کے درمیان دھند چھائی‘ چاہے وہ صحابہ کا دور ہو‘ تاتاریوں کا فتنہ یا حالیہ دور میں شام کا المیہ‘ ایسے حالات میں نبوی ہدایت یہی رہی ہے: ((فَاعْتَزِلْ تِلْكَ الْفِرَقَ كُلَّهَا)) ’’ان تمام گروہوں سے الگ ہو جاؤ‘‘۔ بعض اوقات کسی فریق کا انتخاب کرنا یا دوطرفہ (bipartisan) ہونا دانش مندی نہیں ہوتی‘ بلکہ حق کی تلاش کے لیے انتظار اور خلوت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ رسول اللہﷺ نے ایسے وقت کی نشان دہی فرمائی جب انسان اپنے جلیس (قریبی ساتھی) سے بھی محفوظ نہیں رہے گا۔

اس گھمبیر صورتِ حال میں فتنے کے دور کا سب سے بڑا تقاضا یہی ہے کہ آدمی خود کو شور و غوغا سے الگ رکھے۔ ہر دعوتِ قیام کے جواب میں ایک بنیادی سوال اٹھایا جائے: ’’کیا یہ قیام کا وقت ہے یا سکوت کا؟‘‘ کیونکہ دین صرف ایکشن اور ایجی ٹیشن کا نام نہیں ہے۔ بعض اوقات پسپائی‘ خاموشی اور قلب کا سکون ہی ایمان کی سب سے بڑی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ تاریخ انسانی میں ایسے ادوار بھی آئے جن کی بابت رسول اللہﷺ نے پہلے ہی متنبہ فرما دیا تھا کہ جب فتنے اس شدت سے پھیل جائیں کہ حق و باطل کے درمیان تمیز دشوار ہو جائے‘

تو اس وقت سب سے بڑی دانش دست برداری (retreat) میں ہے۔ نبوی فرمان کہ ’’اپنی تلوار کو پتھر پر مار کر توڑ دو‘‘ محض ایک علامتی حکم نہیں بلکہ فکری اور رویے میں تبدیلی کا پیش خیمہ ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ جس فتنے میں قتل و غارت گری ہی مقصود بن جائے‘ وہاں ہتھیار ڈال دینا ہی سب سے بڑی فتح ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک صحابیؓ کو جب ان کے گوشہ نشین ہونے پر ٹوکا گیا تو انہوں نے لکڑی کی تلوار نکال کر دکھائی اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم پر اپنی آہنی تلوار توڑ دی ہے۔ اسی طرح ’’الترغیب والترھیب‘‘ کی روایت کے مطابق‘ آپ ﷺ نے فتنوں کے دور میں ظلم کے سامنے سینہ سپر ہونے کے بجائے ’’خیر ابنی آدم‘‘ (آدم کے دو بیٹوں میں سے خیر والے یعنی ہابیل) کی روش اپنانے کا حکم دیا‘ جس نے فتنہ روکنے کے لیے اپنی جان تو دے دی مگر فتنے کو مہمیز نہ دی۔

موجودہ دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ خاموشی‘ جو کبھی ایک فضیلت تھی‘ اب کمزوری سمجھی جانے لگی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ((اللِّسانُ فيها أشَدُّ مِن وَقْعِ السَّيفِ))(سنن ابی داؤد:۴۲۶۵) ’’اس فتنے میں زبان کا وار تلوار کے وار سے زیادہ مہلک ہوگا‘‘ مگر آج ہر شخص معاملے کی نزاکت اور دینی بصیرت سے عاری ہونے کے باوجود‘ ہر موضوع پر لب کشائی ضروری سمجھتا ہے۔ جدید ذہن اس فریب میں مبتلا ہے کہ اسے ہر حال میں کچھ بولنا‘ لڑنا اور کوئی نہ کوئی محاذ کھولنا ہے۔

مذہبی نوجوان اور سائبر جہاد کا سراب

یہاں خاص طور پر ان مذہبی نوجوانوں سے مخاطبت ہے جو ایک جذباتی ہیجان کا شکار ہیں۔ الحاد‘ لبرل ازم اور مارکس ازم کے خلاف مورچہ زن ان نوجوانوں سے میرا سوال ہے کہ: ’’بھائی! آپ کی علمی اساس کیا ہے؟‘‘ جن نوجوانوں کو نہ اپنی دینی روایت کا گہرا فہم ہے‘ نہ علمی تاریخ کا ادراک‘ اور نہ ہی ان ازمز (isms) کی زبان اور منطق سے واقفیت ہے‘ وہ آخر کس بنیاد پر سائبر مجاہد بن کر میدان میں اُتر آئے ہیں؟ یہ ’’کی بورڈ‘‘ کی جنگیں‘ لائکس اور کمنٹس کا تعاقب‘ مغالطوں پر مبنی جذباتی ویڈیوز کیا واقعی دین کی خدمت ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ دین کی خدمت سے زیادہ انا کی تسکین کا سامان معلوم ہوتا ہے۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ اس بے سمتی کی جنگ کا انجام نہایت ہولناک نکل رہا ہے۔ سینکڑوں نوجوان اپنی ہی جہالت کے باعث ان فکری اُلجھنوں میں ایسے الجھے کہ بالآخر دین سے ہی دور ہو گئے‘ اور بہت سے تو صریحاً الحاد کی تاریک کھائیوں میں جا گرے۔

انکار کی نفسیات: شبہات یا شہوات؟

آج کل والدین کی جانب سے یہ دہائی کثرت سے سننے کو ملتی ہے کہ ان کی اولاد راہِ ہدایت سے بھٹک چکی ہے۔ ایسے نوجوانوں سے گفتگو کرتے ہوئے داعی کا دل بھی ہچکچاتا ہے؛ یہ اندیشہ دامن گیر ہوتا ہے کہ کہیں ہمارا جواب اس کی ضد میں مزید پختگی کا باعث نہ بن جائے اور وہ یہ گمان نہ کر بیٹھے کہ اس نے ’’ایک اور مولوی کو پچھاڑ دیا‘‘۔ حقیقت یہ ہے کہ جو حق کو قبول نہ کرنے کا تہیہ کر چکا ہو‘ اسے دنیا کی کوئی دلیل مطمئن نہیں کر سکتی۔ ایسے لوگ

کسی فکری غلط فہمی (intellectual confusion) کا شکار نہیں ہوتے‘ بلکہ شعوری انکار کی حالت میں ہوتے ہیں۔ دورِ حاضر کا اصل المیہ شبہات (doubt) نہیں بلکہ ’شہوات‘ (desires) ہیں۔ انسانی دل مادی لذتوں کے اسیر ہو چکے ہیں اور سوشل میڈیا نے ہوس پرستی کے ایسے دروازے کھول دیے ہیں کہ انسان حق کو جانتے ہوئے بھی اس لیے نہیں مانتا کہ اسے اپنی خواہشات کی قربانی دینی پڑے گی۔

دجّالی فتنے اور خود اعتمادی کا سراب

رسول اللہ ﷺ نے دجال کے فتنے سے دور رہنے کی تاکید فرماتے ہوئے ایک نفسیاتی گرہ کھولی ہے:

((مَنْ سَمِعَ بِالدَّجَّالِ فَلْيَنْأَ عَنْهُ، فَوَاللهِ إِنَّ الرَّجُلَ لَيَأْتِيهِ وَهُوَ يَحْسِبُ أَنَّهُ مُؤْمِنٌ فَيَتَّبِعُهُ، مِمَّا يَبْعَثُ بِهِ مِنَ الشُّبُهَاتِ[أَوْ لِمَا يَبْعَثُ بِهِ مِنَ الشُّبُهَاتِ]))

(سنن ابی داؤد:۴۳۱۹)

’’جو شخص دجال کے بارے میں سنے‘ وہ اس سے دُور ہو جائے۔ اللہ کی قسم! ایک شخص یہ گمان کرتے ہوئے دجال کے پاس جائے گا کہ میں تو مؤمن ہوں‘ لیکن وہ اس کے شبہات سے متاثر ہو کر اس کا پیروکار بن جائے گا۔‘‘

آج ہم اپنی آنکھوں سے یہ اذیت ناک منظر دیکھ رہے ہیں کہ وہ نوجوان جو خود کو فکری طور پر مستحکم سمجھتے تھے‘ یوٹیوب کی محض ایک ویڈیو یا کسی ملحد کے ایک سطحی سوال پر لرز اٹھتے ہیں۔ ان کا ایمان ریت کی دیوار ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس کی بنیاد جذبات پر تھی‘ علم پر نہیں۔ ایسے پُرآشوب حالات میں شریعت کا اولین مطالبہ جارحانہ مہم جوئی نہیں بلکہ حفاظتِ خود اختیاری ہے۔ قرآنِ حکیم کا واضح حکم ہے:

﴿قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (التحریم:۶)

’’اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔‘‘

فتنے کے اس دور میں دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر ایرے غیرے سے مناظرے کرنے کے بجائے علمائے ربانی‘ اہلِ دل اور راسخون فی العلم کی پناہ تلاش کرے۔ ان کے سائے میں بیٹھ کر اپنی عقل کی تہذیب اور قلب کی تربیت کرے‘ کیونکہ تنہا راستہ چلنے والا شیطان کا آسان لقمہ ہوتا ہے۔

یہ ایک بنیادی سوال ہے کہ آخر ہمیں یہ اختیار کس نے دیا کہ ہم بن بلائے ہر نظریاتی جنگ کے سپاہی بن جائیں! کس نے یہ ذمہ داری ہم پر ڈالی ہے کہ ہر ملحد اور ہر مستشرق کو جواب دینا ہمارا ہی کام ہے؟ ہر سوال میں الجھنا اور ہر بحث میں اکیلے کود پڑنا دانش نہیں بلکہ خبطِ خود نمائی ہے۔ دین کی خدمت جذبات کے بے لگام اظہار سے نہیں‘ بلکہ اساتذہ کی نگرانی میں علمی استقامت پیدا کرنے سے ہوتی ہے۔

تزکیہ اور اقامتِ دین: متضاد نہیں‘ تکمیلی پہلو

عصرِ حاضر میں دین کی تعبیر و تفہیم کے حوالے سے چند عجیب و غریب تضادات نے جنم لیا ہے۔ ایک طبقہ دین

کو محض انفرادی تزکیۂ نفس تک محدود کر کے پیش کر رہا ہے‘ جبکہ دوسرا گروہ صرف اقامتِ دین یعنی اجتماعی نظام کے نفاذ کو ہی کُل دین قرار دیتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کو ایک دوسرے کا حریف بنا کر ایک غیر متوازن بیانیہ تشکیل دیا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تزکیۂ نفس اور اقامتِ دین ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ دین جہاں انسانی باطن کی تطہیر چاہتا ہے‘ وہیں وہ اجتماعی زندگی کو بھی عدل‘ خیر اور توحید کے آفاقی اصولوں پر استوار کرنے کا داعی ہے۔

انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج سطحی مطالعے اور ناپختہ فہم کی بنیاد پر اُمّت کو اقامتِ دین کا پروگرام دینے والے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں نہ تو دینی اصطلاحات کی گہرائی کا علم ہے اور نہ ہی وہ ان کا درست تلفظ ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں‘ مگر دعویٰ یہ ہے کہ وہ پوری اُمّت کی فکری رہنمائی کر رہے ہیں۔ اکبرالٰہ آبادی نے اسی قسم کی آزادی پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا: ؎

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
گلے میں جو آئیں وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسر
اناالحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ!

آج صورتِ حال یہ ہے کہ چند لفظی ہیر پھیر سیکھ کر لوگ خود کو مفکرِ اُمّت تصور کرنے لگے ہیں‘ حالانکہ وہ تزکیے کے اصل مفہوم اور اقامتِ دین کے وسیع دائرے سے کُلّی طور پر ناواقف ہیں۔ دین کا اصل تقاضا یہ ہے کہ انفس (فرد کی ذات) اور آفاق (معاشرہ و ریاست) دونوں جگہ اللہ کا غلبہ قائم ہو۔ تزکیۂ نفس بھی ناگزیر ہے اور ایک عادلانہ معاشرے کا قیام بھی ضروری ہے۔ یہاں اصل علمی بحث یہ نہیں کہ ان میں سے کیا کیا جائے‘ بلکہ اصل سوال آغاز اور ترتیب کا ہے کہ سفر کہاں سے شروع ہو!

اس ترتیبِ عمل کو سمجھنے کے لیے اکبرالٰہ آبادی کا یہ شعر ایک مکمل فلسفہ پیش کرتا ہے: ؎

خدا کے کام دیکھو ‘بعد کیا ہے اور کیا پہلے!
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!

غارِ حرا وہ مقامِ تزکیہ ہے جہاں نبوت کی ابتدا ہوئی اور بدر وہ میدانِ عمل ہے جہاں دین کا اجتماعی غلبہ ظاہر ہوا۔ گویا جب تک باطن غارِ حرا کی روشنی سے منور نہ ہو‘ میدانِ بدر میں کامیابی کا خواب ادھورا ہے۔ کسی دانشور کا یہ قول نہایت پُرمغز ہے کہ:

"There cannot be an Islamic state without an inner Islamic state"

’’ایک داخلی اسلامی ریاست کے قیام کے بغیر خارجی اسلامی ریاست کا وجود ناممکن ہے۔‘‘

جب تک فرد کے فکر و شعور اور قلب و نظر میں دین کی حاکمیت قائم نہیں ہوتی‘ اجتماعی سطح پر اسلامی نظام کا خواب

شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک بڑی فکری غلط فہمی ہے کہ تزکیہ پر زور دینے والے اقامتِ دین کے مخالف ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر مؤمن کی قلبی خواہش غلبۂ دین ہی ہے‘ اختلاف محض منہج اور ’طریق کار‘ کا ہے۔ مقصد سب کا ایک ہی ہے: کلمۃ اللہ کی سربلندی۔

تحریکیت بمقابلہ عبادت: ایک مصنوعی تصادم

افسوس ناک امر یہ ہے کہ دورِ حاضر میں عبادت اور تحریکیت کے درمیان ایک مصنوعی جھگڑا کھڑا کر دیا گیا ہے۔ کچھ حلقوں کی جانب سے روایتی دینی شعائر اور عبادات کو ’’پوجا پاٹ‘‘ کہہ کر استخفافی انداز میں پیش کیا جاتا ہے‘ یہ کہہ کر کہ مولویوں نے قوم کو محض تسبیح و مناجات میں اُلجھا کر اصل مقصد یعنی سیاسی غلبے سے دور کر دیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا اسلامی انقلاب ہوگا جو بندگی کی توہین اور عبادات کی تحقیر کی بنیاد پر برپا کیا جائے گا؟ بندگی کا پہلا اور بنیادی تقاضا ہی پرستش ہے؛ اگر بندگی کی یہ روح ہی مفقود ہو جائے تو پھر تحریک محض ایک بے جان سیاسی ڈھانچا بن کر رہ جاتی ہے۔ آج کل ایک مخصوص طبقہ روشن خیالی کے زعم میں نوجوانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے کہ: ’’دین کا اصل مفہوم تو اُمّت سے چھپا لیا گیا تھا‘ جواب ہم واضح کریں گے۔‘‘ یہ نام نہاد دانشور بڑے طمطراق سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ دین محض ایک سسٹم (نظام) کا نام ہے‘ جبکہ عبادات و تزکیہ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

پڑھے لکھے نوجوان ان کے سحر انگیز اسلوب اور جدید سسٹم کی اصطلاحات سے متاثر ہو کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ شاید صدیوں سے چلے آنے والے اکابر‘ فقہاء اور صوفیاء دین کو سمجھنے سے قاصر رہے تھے۔ یہ دانشور حضرات جس سسٹم کا ڈھول پیٹ رہے ہیں‘ وہ درحقیقت دین کو محض ایک مادی اور سیاسی نظریے (ideology) میں بدلنے کی شعوری یا لاشعوری کوشش ہے‘ جس میں روح کا کوئی حصہ نہیں۔

عصری تعلیم اور ذہنی پستی (Dumbing Down Effect)

علم اور ادب کے باہمی تعلق کے حوالے سے ایک نہایت تشویش ناک پہلو وہ فکری تنزلی ہے جو دورِ حاضر کے تعلیمی منظرنامے میں رچ بس گئی ہے۔ وہ لوگ جو دینی یا دنیاوی کسی بھی نظمِ تدریس سے وابستہ ہیں‘ ان کا یہ عمومی تجربہ ہے کہ حالیہ چند برسوں میں طلبہ کی ذہنی استعداد جس تیزی سے گری ہے‘ اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔

یہ جدید عہد کا Dumbing Down Effect ہے‘ جہاں ہر نیا تعلیمی سال پچھلے سے زیادہ فکری پستی کا شکار نظر آتا ہے۔ یونیورسٹیوں کی اصل صورتِ حال یہ ہے کہ سائبر ٹیکنالوجی نے ذہن کو مفلوج کر دیا ہے۔ معلومات کی بہتات تو ہے مگر ادراک و تفہیم کا کال پڑ چکا ہے۔ شعور کی سطح مسلسل نیچے جا رہی ہے اور اس کے ساتھ ادب کا جنازہ بھی نکل چکا ہے۔

کثرتِ الفاظ اور فقدانِ معنی

امام عبداللہ بن مبارکؒ کا قول اس مخدوش صورتِ حال میں تازیانے کا کام کرتا ہے کہ: ’’ہم کثیر علم کے

مقابلے میں تھوڑے سے ادب کے زیادہ محتاج ہیں''۔ آج ہمارے گرد وپیش میں الفاظ کا ہجوم مگر معانی کا قحط ہے۔
ہم اس دور میں داخل ہو چکے ہیں جس کی بابت رسول اللہ ﷺ نے پہلے ہی متنبہ فرما دیا تھا کہ: ''تم ایک ایسے دور میں ہو جہاں فقہاء زیادہ اور خطباء کم ہیں‘ لیکن ایک وقت آئے گا جب خطیب بہت ہوں گے اور فقیہہ (علم کی گہرائی رکھنے والے) کم۔''

آج چرب زبانی اور لسانی مہارت کو ہی کامیابی کی معراج سمجھ لیا گیا ہے‘ جبکہ بصیرت اور تہذیب کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی اُمّت کے لیے جس سب سے بڑے خطرے کی نشان دہی فرمائی‘ وہ ''علیم اللسان منافق'' (زبان دراز اور فصیح بیان منافق) تھا۔ المیہ یہ ہے کہ لوگوں کی زبان تو شعلہ بار ہے مگر ان کا دل سوزِ ایمانی اور بندگی کی تڑپ سے خالی ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے اس فکری و روحانی تضاد کو ایک ہی مصرعے میں سمو دیا ہے: ''ہے زباں گرم‘ قلب ٹھنڈا ہے!''

یہ محض ایک مصرع نہیں بلکہ پوری جدید تہذیب کا نوحہ ہے‘ جہاں تقریر و خطاب کی گرمی تو موجود ہے مگر وہ حرارتِ قلبی مفقود ہے جو انسان کو اللہ کے سامنے جھکا دے اور اسے باادب بنا دے۔ سبحان اللہ! اب زبان تو خوب رواں ہے‘ مگر دل میں وہ سوزِ ایمانی مفقود ہے جو کردار کو بدل دے۔ دو دو‘ تین تین گھنٹوں پر محیط طویل تقریریں‘ سحر انگیز لب ولہجہ اور اسٹیج پر ایسی بھرپور پرفارمنس دکھائی جاتی ہے کہ حاضرین دم بخود رہ جاتے ہیں۔ اس تمام تر فکری و تبلیغی مہم کے پس پردہ ایک ہولناک حقیقت پوشیدہ ہے۔ ان خطباء نے اپنا پورا بیانیہ اسلاف اور اکابر کی فہم سے رشتہ توڑ کر قائم کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ جب تک نئی نسل اپنے دینی ورثے اور علمائے ربانی کی روایت سے جڑی رہے گی‘ ان کی فکری انفرادیت کا جادو نہیں چل سکے گا۔ لہٰذا‘ ان کی کامیابی کا دار و مدار نوجوانوں کو اپنے اکابر سے بدگمان اور بے نیاز کر دینے میں ہی ہے۔

آج کل ایک مخصوص طبقہ نہایت مقبول ہے جو روزمرہ کی بنیاد پر یہ زہر نوجوانوں کے ذہن میں گھول رہا ہے کہ ان کی بربادی کے اصل ذمہ دار تین طبقے ہیں: والدین‘ اساتذہ اور مولوی حضرات۔ گویا نئی نسل کی تمام تر خرابیوں کا ملبہ انہی تین طبقات پر ڈال دیا گیا ہے۔ یہ بیانیہ اب محض ایک رائے نہیں بلکہ باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچ رہا کہ اگر معاشرے سے ان تین ستونوں کا احترام ختم ہو گیا‘ تو دینی و سماجی اقدار کی پوری عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔ یہ صورتِ حال عین اس نبوی پیش گوئی کے مطابق ہے: ((اَنْ تَلِدَ الْأَمَةُ رَبَّتَهَا)) (صحیح مسلم: ۸) ''کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنم دے گی۔'' یعنی اقدار اُلٹ جائیں گی‘ مراتب کا فرق مٹ جائے گا اور رشتوں کا تقدس پامال ہو جائے گا۔

قدیم تہذیبی اصولوں (جیسے کنفیوشس کے پانچ بنیادی سماجی تعلقات) سے اسلامی تعلیمات تک‘ معاشرے کا توازن پانچ رشتوں پر قائم ہے: والدین و اولاد‘ بڑے و چھوٹے بہن بھائی‘ شوہر و بیوی‘ حاکم و رعایا‘ استاد و شاگرد۔ آج جدیدیت اور نام نہاد مذہبی دانشوری کی چادر اوڑھ کر ان تمام رشتوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

وہی نوجوان جو دین کی تلاش میں نکلے تھے‘اب اپنے ہی محسنوں (والدین‘اساتذہ اور علماء) کے خلاف صف آرا ہیں۔

یہ صورتِ حال قلب ونظر کے لیے شدید بے چینی کا باعث ہے۔اسی لیے اب اس امر کی شدید حاجت ہے کہ ادب پر زور دیا جائے‘ کیونکہ علم اگر ادب سے عاری ہو جائے تو وہ روح کے لیے زہر بن جاتا ہے۔علامہ اقبال نے اسی کرب کا اظہار یوں کیا تھا:؎

نوجوانے را چو بینم بے ادب
روزِ من تاریک می گردد چو شب

’’جب میں کسی نوجوان کو بے ادب دیکھتا ہوں‘ تو میرا دن رات کی طرح تاریک ہو جاتا ہے۔‘‘

انہوں نے سچ کہا تھا کہ جب نوجوان بے ادب ہو جائے تو دن کی روشنی بھی شب کی تاریکی میں بدل جاتی ہے۔آج کے دور کا سب سے ہولناک المیہ ادب کا تیزی سے مفقود ہونا ہے۔وہ احترامِ باہمی جو کبھی شاگرد کو استاد سے‘اولاد کو والدین سے اور اصاغر کو اکابر سے جوڑے رکھتا تھا‘ اب قصۂ پارینہ بنتا جا رہا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جب دل سے محبت رخصت ہو جائے تو وفا اور لحاظ کی خوشبو بھی باقی نہیں رہتی۔آج زبان میں وہ رعایت رہی نہ لہجے میں وہ جھکاؤ۔لوگ کوئی لفظ بولنے سے پہلے اس کے اثرات پر بھی غور نہیں کرتے۔

کچھ روز قبل چند احباب کی گفتگو کے دوران جب یہ جملے کانوں میں پڑے کہ ’’میں فلاں کا follower ہوں‘‘ اور ’’میں فلاں کو فالو کرتا ہوں‘‘ تو اس فکری تنزلی پر دل لرز اٹھا۔وہ اُمّت جس کے نوجوان کبھی امام ابوحنیفہ‘ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل ؒ جیسے جلیل القدر ائمہ کے پیروکار ہونے پر فخر کرتے تھے‘ آج یوٹیوبرز اور ٹک ٹاکرز کی پیروی کو اپنا اعزاز سمجھ رہی ہے! یہ بلندی سے پستی کی طرف ایک ایسا سفر ہے جس کی ہولناکی کا شعور مفقود ہو چکا ہے۔لوگ ان الفاظ کے مفہوم پر غور نہیں کرتے کہ وہ کس کو اپنا مقتدا (followed) بنا رہے ہیں۔ کیا کبھی کسی نے سوچا کہ یہ سب محض تفریح نہیں بلکہ باقاعدہ ایک کھیل ہے؟ ایک ایسا کھیل جو دن دہاڑے آپ کے شعور کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے۔

نائٹ کلبز اور منشیات کی تباہ کاریاں تو سب کو نظر آتی ہیں‘ لیکن اس ذہنی یلغار پر کسی کی توجہ کیوں نہیں جاتی؟ یہ ڈیجیٹل فالوورشپ دراصل ایک گہرا منصوبہ ہے جو آپ کے رشتوں کو کاٹنے‘ آپ کی شناخت مٹانے اور آپ کی روحانی بنیادوں کو متزلزل کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔یہ محض اسکرین پر نظر آنے والا کوئی تماشا نہیں‘ بلکہ ایک منظم عمل ہے جو ہماری اقدار اور معاشرتی ترتیب کو خاموشی سے پیوندِ خاک کر رہا ہے۔جب معیارِ کامل (Ideals) بدل جاتے ہیں‘ تو پوری تہذیب کا رخ بدل جاتا ہے۔آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم دیکھیں کہ ہم کس کے پیچھے چل رہے ہیں اور ہماری منزل کیا ہے!

فقہ اور فکر: ایک مصنوعی تقسیم کا فتنہ

عصرِ حاضر کا ایک عجیب تضاد فقہ اور فکر کے درمیان قائم کی جانے والی مصنوعی binary ہے۔آج کل یہ تاثر

عام کیا جا رہا ہے کہ علمائے کرام اور مولوی حضرات سے محض چھوٹے موٹے فقہی مسائل پوچھ لیے جائیں‘ جبکہ فکری گفتگو کے لیے ان نام نہاد مفکرین کی طرف رجوع کیا جائے جو خود کو اسلامی مفکر کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ گویا دین کا فہم اور بصیرت کسی ایسی مخصوص مخلوق کے پاس آ گئی ہے جو راسخ علم سے عاری مگر جدید اصطلاحات سے لیس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ’’فکر‘‘ کا لفظ ایک فیشن بن چکا ہے۔ یہ اصطلاح دراصل استعماری دور کی پیداوار ہے‘ جسے دین کے حقیقی اور راسخ علم سے انحراف کے لیے استعمال کیا گیا۔ بار بار ’’فکرِ اسلامی‘‘ کی گردان تو کی جاتی ہے‘ مگر کوئی یہ نہیں بتاتا کہ علومِ نبوت کی روشنی میں اس اصطلاح کا وجود کہاں ہے!

دنیاوی علوم میں تو ہر شخص کی ایک واضح شناخت ہوتی ہے‘ جیسے سائیکالوجسٹ‘ بیالوجسٹ یا جیالوجسٹ۔ اسی طرح دینی میدان میں بھی محدث‘ فقیہہ‘ مفسر اور متکلم جیسے پختہ عنوانات موجود ہیں۔ آج ہم ’’اسلامک اسکالر‘‘ اور ’’ریسرچ اسکالر‘‘ جیسی مبہم اور من گھڑت شناختوں کے جنگل میں گھر چکے ہیں۔ ان خود ساختہ اسکالرز سے اگر کوئی پوچھے کہ آپ کی علمی سند کیا ہے‘ آپ کا استاد کون ہے‘ اور آپ کی علمی نسبت کس روایت سے ہے‘ تو جواب میں خاموشی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ بس ایک مائیک اور سوشل میڈیا کا پلیٹ فارم میسر ہے‘ جس کے بل بوتے پر یہ حضرات ہر مسئلے پر فتویٰ دینے اور ہر میدان میں اپنے فکر کا لوہا منوانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ یہ سب دراصل فقہ کی اہمیت کو کم تر دکھانے اور اپنی بے بنیاد سوچ کو بلند مقام دینے کی ایک شعوری کوشش ہے۔

دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ فکری سوالات ان مفکرین سے کیے جائیں‘ حالانکہ اصل علم اور حقیقی معرفت تو فقہ ہی میں پوشیدہ ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فقہ کی جو تعریف فرمائی‘ وہ علم کی گہرائی کا سمندر ہے:

((مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَا لَهَا وَمَا عَلَيْهَا))

’’انسان کو یہ جاننا کہ اس کے لیے کیا ہے اور اس پر کیا ذمہ داری ہے۔‘‘

یہی تفقہ ہی حقیقی علم ہے جو انسان کو اپنی بندگی کا شعور عطا کرتا ہے۔ اگر فقہ کو محض معمولی مسائل کا مجموعہ قرار دے کر مسترد کر دیا جائے اور فکر کے نام پر لایعنی باتوں کو علم بنا کر پیش کیا جائے‘ تو دین کی اصل روح فنا ہو جائے گی۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ جب بنیادیں ہی کھوکھلی ہوں گی تو اس پر کھڑی ہونے والی فکر کی عمارت کتنی دیر پائیدار رہ سکے گی!

متن سے تصویر تک: انسانی شعور کی تبدیلی

عصرِ حاضر کا ایک نہایت عمیق اور سنگین فتنہ ’’تصویر‘‘ کا غلبہ ہے۔ ہم ایک ایسی بڑی تبدیلی سے گزر رہے ہیں جہاں انسانی تہذیب متن (text) کے علمی حصار سے نکل کر تصویر (image) کے سحر میں منتقل ہو چکی ہے۔ بظاہر یہ ایک سادہ سی تبدیلی معلوم ہوتی ہے‘ مگر اس نے انسانی شعور (consciousness) اور اس کے خارجی اظہار یعنی ہماری تہذیب و ثقافت پر نہایت پیچیدہ اور دُور رَس اثرات مرتب کیے ہیں۔ تصویر چاہے جامد (still) ہو یا متحرک (moving)‘ اس کی فتنہ سامانیوں سے آج کوئی شعبۂ زندگی محفوظ نہیں۔ تصویر کا سب سے مہلک پہلو یہ ہے

کہ یہ انسان کو غیر فعال (passive) بنا دیتی ہے۔ جب ہم کسی تصویر یا ویڈیو کے سامنے ہوتے ہیں' تو ہمارا تنقیدی شعور مفلوج ہو جاتا ہے۔ ہم محض ایک تماشائی بن کر اس کے اثرات کو بلا سوچے سمجھے جذب کرنے لگتے ہیں۔

آج کی بڑی بڑی مشہور شخصیات اور celebrities کی مقبولیت کا طلسم صرف تصویر ہی کا مرہونِ منت ہے۔ اگر آپ کسی نام نہاد اسٹار کی ویڈیو بند کر کے صرف اس کی آڈیو (گفتگو) سنیں' تو آپ کو فوراً اندازہ ہو جائے گا کہ ان کی باتوں میں کتنا وزن ہے اور وہ علمی و فکری اعتبار سے کتنے کھوکھلے ہیں۔ یہ امیج کلچر کا جادو ہے جو سطحی باتوں کو بھی معتبر بنا کر پیش کرتا ہے۔ فرانسیسی مفکر Guy Debord نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب The Society of the Spectacle میں اس صورتِ حال کا نہایت گہرا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اگر اس اصطلاح کا ترجمہ کیا جائے تو ہم اسے ''تماش بین سماج'' کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ معاشرہ ہے جہاں ہر احساس' ہر پیغام اور ہر خیال کو ایک امیج کی صورت دے دی گئی ہے۔ ہم ایک ایسی دنیا میں مقیم ہیں جہاں حقیقت کے بجائے اس کی تصویر زیادہ اہم ہو چکی ہے۔ مولانا رومؒ نے صدیوں پہلے اس نفسیاتی بچپن کی کیا خوب نقشہ گری فرمائی تھی:

پس نکو گفت آن حکیمِ کامیار
کہ تو طفلی خانۂ پُر نقش و نگار

''کیا خوب بات کہی ہے اس سمجھ دار اور دانا شخص (حکیم سنائیؒ) نے کہ تُو ابھی بچہ ہے اور یہ دنیا محض بچوں کا گھر ہے جو نقش و نگار سے سجا ہوا ہے۔''

ہم اس مادی اور تصویری دنیا کے نقش و نگار میں ایسے الجھے ہیں کہ حقیقتِ ابدی سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ اگرچہ باری تعالیٰ نے اس کائنات کو فطری زینت عطا فرمائی ہے' مگر جدید ٹیکنالوجی نے اس کے متوازی ایک ایسی مصنوعی دنیا کھڑی کر دی ہے جس کی جمالیاتی کشش اور چمک دمک غیر معمولی ہے۔ یہ ڈیجیٹل دنیا نہ صرف سجی سنوری ہے بلکہ نہایت سستی' بلکہ تقریباً مفت ہو چکی ہے۔ آج موبائل فون محض ایک آلہ نہیں رہا بلکہ لذتوں کی ایک ایسی متحرک فیکٹری بن چکا ہے جو ہر وقت آپ کی دسترس میں رہتی ہے اور آپ کے شعور کو مسلسل ایک مخصوص ہیجانی کیفیت میں مبتلا کیے رکھتی ہے۔ یہی وہ صورتِ حال ہے جو انسان کو ''لذتوں کی مشینی دوڑ'' (Hedonistic Treadmill) میں جھونک دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی بے سمت تگ و دو ہے جس میں انسان پاؤں تو تیزی سے مار رہا ہوتا ہے مگر کہیں پہنچ نہیں پاتا؛ وہ تھک کر نڈھال تو ہو جاتا ہے مگر رک نہیں سکتا' کیونکہ اس راستے پر منزل کا وجود ہی نہیں۔

لذتوں کا یہ طوفان اس قدر شدید ہے کہ اب انسان تصویر اور ویڈیو کے اس حد تک عادی ہو چکے ہیں کہ کیمرے کی غیر موجودگی میں ان کی شخصیت ہی معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ کچھ لوگ تو اب زبان ہی تب کھولتے ہیں جب انہیں یقین ہو جائے کہ ان کا ہر لفظ ریکارڈ ہو رہا ہے۔ یہ کوئی مزاحیہ تبصرہ نہیں بلکہ ایک تلخ سماجی حقیقت ہے کہ کیمرہ اب بہت سے افراد کے لیے اظہار کی آکسیجن بن چکا ہے۔ ان کا وجود صرف اسی وقت معتبر ہوتا ہے جب وہ لینز کی گرفت میں ہوں۔ ہم نے شعوری طور پر ایک ایسی تماش بین' تصویر زدہ اور لذت پرست دنیا کا انتخاب کر لیا

ہے جہاں مادی کشش کے سامنے انسان کی روحانیت دم توڑ رہی ہے۔ اس فکری واخلاقی دیوالیہ پن پر شاعر نے کیا خوب طنز کیا ہے: ؎

دوزخ کے داخلے میں نہیں ان کو عذر کچھ
فوٹو کوئی لگا دے جو ان کا بہشت میں

یہ شعر اس عہد کی عکاسی کرتا ہے جہاں انسان حقیقت سے زیادہ نمائش کا رسیا ہو چکا ہے' یہاں تک کہ وہ نمائش کی خاطر ابدی خسارے کا سودا کرنے پر بھی آمادہ ہے۔

مولانا یوسف بنوریؒ نے برسوں پہلے ایک فکر انگیز مضمون تحریر کیا جس کا عنوان تھا: ''علماء و مصلحین اُمّت اور ان کے فتنے۔'' اس تحریر کا ایک کلیدی نکتہ ''ہر دل عزیزی'' (popularity) کا فتنہ ہے' جو آج کے دور میں غیر معمولی شدّت اختیار کر چکا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((مَا ذِئْبَانِ جَائِعَانِ أُرْسِلَا فِي غَنَمٍ بِأَفْسَدَ لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِينِهِ)) (سنن الترمذی:۲۳۷۶)

''دو بھوکے بھیڑیے اگر بکریوں کے گلے میں چھوڑ دیے جائیں تو وہ جتنا نقصان کریں گے' اس سے کہیں زیادہ نقصان انسان کے دین کو اس کی مال اور عزت کی حرص پہنچاتی ہے۔''

علماء نے 'حُبِّ دُنیا' کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: حُبِّ مال اور حُبِّ جاہ (شہرت و منصب کی محبت)۔ آج سوشل میڈیا' بالخصوص یوٹیوب' ان دونوں مہلک خواہشات کی تسکین کا سب سے بڑا ذریعہ بن چکا ہے۔ یہاں فالوورز' لائکس اور کمنٹس کی صورت میں جاہ (شہرت) حاصل ہوتی ہے' اور دوسری طرف مونیٹائزیشن کے ذریعے ڈالرز کی ریل پیل سے مال کی ہوس پوری ہوتی ہے۔ یہ دوہرا جال انسانی نفس کو آہستہ آہستہ اپنی گرفت میں لے کر اسے ''ہر دل عزیزی'' کی نفسیاتی بیماری میں مبتلا کر دیتا ہے۔

آج کی ڈیجیٹل دنیا میں کامیابی کا واحد معیار وائرل ہونا اور داد سمیٹنا بن چکا ہے۔ فیس بک اور انسٹاگرام پر یہ کیفیت ہے کہ: ''من ترا حاجی بگویم' تو مرا ملّا بگو'' (میں تمہیں حاجی کہوں' تم مجھے ملا کہو)۔ کسی نے محض ایک ادھار لیا ہوا جملہ یا شعر پوسٹ کیا اور فوراً مداحوں کی فوج ''کمال ہے'' اور ''استاد واہ واہ'' کے نعروں کے ساتھ ٹوٹ پڑی۔ ماضی میں ایک عام انسان کو اپنی کسی خوبی پر داد یا شاباشی پانے کے لیے مہینوں یا برسوں انتظار کرنا پڑتا تھا' لیکن اب ہر گھنٹے بعد درجنوں لائکس اور تعریفی کمنٹس کا سیلاب امڈ آتا ہے۔ آپ خود سوچیے کہ جس انسان کو ہر وقت مصنوعی بلندیوں پر بٹھایا جائے' کیا اس کا دماغ زمین پر رہے گا؟ کیا اس کا نفس فرعونیت کی حد تک نہیں پھول جائے گا؟ یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ مسلسل ثنا خوانی انسان کے تقویٰ اور عاجزی کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے۔

اگر ہم نیوروسائنس کے پیچیدہ نظریات جیسے Dopamine کے اثرات کو ایک طرف رکھ کر صرف خالص انسانی مشاہدے کی بات کریں' تب بھی صورت حال نہایت خطرناک ہے۔ یہ محض ایک سرگرمی نہیں بلکہ ایک نشہ

ہے جو انسان کو اپنی ذات کے حصار میں قید کر دیتا ہے۔ جب نمود و نمائش ہی زندگی کا مقصد بن جائے‘ تو اخلاص رخصت ہو جاتا ہے اور انسان محض ایک ایسی پراڈکٹ بن کر رہ جاتا ہے جس کی قیمت صرف اس کے ویوز سے لگائی جاتی ہے۔

ایک مشہور نظریہ ہے کہ ’’Medium is the Message‘‘، یعنی جس ذریعے کو آپ اختیار کرتے ہیں‘ وہی آپ کے پیغام کی ہیئت اور اسلوب طے کرتا ہے۔ سوشل میڈیا پر آنے والے کو اب باقاعدہ یہ سکھایا جاتا ہے کہ: ’’تمہارا Thumbnail ایسا ہیجانی ہو کہ لوگوں کی توجہ کھینچ لے۔‘‘

’’ویڈیو کے ابتدائی چند سیکنڈز میں وہ ہک (hook) ہو جو لوگوں کو رکنے پر مجبور کرے۔‘‘

’’تمہارا لب و لہجہ اور باڈی لینگویج اس میڈیم کی طلب کے مطابق پرفارمنس بن جائے۔‘‘

یہ اب ایک مکمل سائنس ہے جس کے کورسز ہو رہے ہیں اور مارکیٹنگ کمپنیاں چل رہی ہیں۔ اکبرالٰہ آبادی نے اسی علمی زوال کی کیا خوب عکاسی کی تھی: ؎

اِک علم تو ہے بُت بننے کا‘ اِک علم ہے حق پہ مرنے کا
اِس علم کی سب دیتے ہیں سند‘ اُس علم میں ماہر کون کرے؟

آج کا المیہ یہی ہے کہ ہم بُت بننے (یعنی خود کو ایک برانڈ کے طور پر پیش کرنے) کے علم میں تو ماہر ہو چکے ہیں‘ مگر حق پر مٹنے اور مٹ جانے کا وہ علم مفقود ہے جو انسان کو مٹی سے جوڑ کر بندہ بناتا تھا۔ عصرِ حاضر میں موٹیویشنل اسپیکنگ اور کامیابی (success) کا جو لٹریچر سیلاب کی طرح پھیل رہا ہے‘ وہ درحقیقت بُت بننے کا علم ہے۔ یہ علم انسان کو اپنی ذات کا معبود بنانے‘ خود کو مرکزِ کائنات سمجھنے اور اپنی انا کی پرستش کا سبق دیتا ہے۔ اس پورے بیانیے میں حق پر مٹنے کا حوصلہ‘ خود کو مٹانے کا جذبہ اور رضائے الٰہی کے لیے گمنامی قبول کرنے کا شعور کہیں نظر نہیں آتا۔

اس پورے لٹریچر کا مرکزی نعرہ (moto) یہ ہے: ’’You can do it‘‘ (تم سب کچھ کر سکتے ہو!)۔ یہ فلسفہ انسان کو باور کراتا ہے کہ اس کی کامیابی کی راہ میں واحد رکاوٹ وہ خود ہے؛ گویا دولت‘ نام اور شہرت کا نہ ملنا صرف اور صرف انسان کا ذاتی قصور ہے۔

انتہائی افسوس ناک امر یہ ہے کہ موجودہ مادی معاشرے میں غربت کو ایک اخلاقی جرم کی صورت دے دی گئی ہے۔ ہر دوسرا رہبر کامیابی (success guru) بل گیٹس کا یہ جملہ دہراتا نظر آتا ہے:

" If you're born poor, it's not your fault. But if you die poor, it's your fault."

’’اگر تم غریب پیدا ہوئے تو یہ تمہاری غلطی نہیں‘ لیکن اگر تم غریب مرے تو یہ سراسر تمہاری اپنی غلطی ہے۔‘‘

یعنی غربت کو ایک اخلاقی جرم بنا دیا گیا ہے‘ اور دولت کمانا گویا ایک مقدس ہدف۔ ہم نے اس معاشرے میں امارت کو عزت اور غریبی کو شرمندگی بنا دیا ہے۔ اس سوچ نے دولت کے حصول کو ایک ’’مقدس ہدف‘‘ بنا دیا ہے۔

ایک ایسا سماج تشکیل دے دیا گیا ہے جہاں امارت عزت کا معیار ہے اور غریبی شرمندگی کا نشان۔ جو لوگ کل تک اپنی حد سے بڑھی ہوئی دولت کی وجہ سے شرمندگی یا جھجک محسوس کرتے تھے‘ آج انہیں آئیکون اور آئیڈیل بنا کر نوجوانوں کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

جب کامیابی کا پورا فلسفہ صرف مادیت اور اعداد و شمار کے گرد گھومنے لگے‘ تو انسان کے اندر سے قناعت‘ توکّل اور شکر جیسے اعلیٰ اوصاف رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہ لٹریچر انسان کو ایک ایسی لامتناہی دوڑ میں لگا دیتا ہے جہاں سکون نام کی کوئی چیز نہیں۔ ’’تم کر سکتے ہو‘‘ کا نعرہ دراصل انسان کو اپنی بندگی کی حدود سے نکال کر خدائی کے دعوے کی طرف لے جانے کی ایک نفسیاتی کوشش ہے۔

پس چہ باید کرد؟ گمنامی کی فضیلت اور پندارِ ذات کا علاج

اس تمام فکری انتشار اور ڈیجیٹل مادیت کے غلبے کے بعد اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ: پس چہ باید کرد (اب ہمیں کیا کرنا چاہیے)؟ اس کا واحد حل اپنے اسلاف کی اُس روایت کی طرف پلٹنا ہے جہاں انہوں نے ’’کتاب التواضع والخمول‘‘ جیسی تصانیف کے ذریعے انسانی نفس کی تربیت کی۔ ’’خمول‘‘ کا مفہوم ہے: گمنامی اختیار کرنا۔ یعنی جان بوجھ کر نظروں سے اوجھل رہنا اور شہرت کی ہوس سے دامن بچانا۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے کسی کو مقبولیت عطا فرما دے تو وہ اس کا انتظامی معاملہ ہے‘ مگر خود بندے کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہو جانا کہ ’’لوگ مجھے جانیں اور پہچانیں‘‘ وہ مہلک مرض ہے جس نے آج دین کے طالب علموں کو بھی اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے علم کے حصول میں نیت کے بگاڑ پر سخت تنبیہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

((مَنْ طَلَبَ العِلْمَ لِيُجَارِيَ بِهِ العُلَمَاءَ أَوْ لِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ أَوْ يَصْرِفَ بِهِ وُجُوهَ النَّاسِ إِلَيْهِ أَدْخَلَهُ اللّٰهُ النَّارَ)) [سنن الترمذی: ۲۶۵۴]

’’جس نے علم اس لیے حاصل کیا کہ اس کے ذریعے علماء سے برابری کرے‘ بے وقوفوں سے تکرار کرے‘ یا لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے تو اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں داخل کرے گا۔‘‘

سوشل میڈیا کا موجودہ ڈھانچا اس حدیث میں بیان کردہ فتنوں کا مکمل عملی نمونہ بن چکا ہے۔ اب ہر شخص اس دوڑ میں مگن ہے کہ لوگ اسے سنیں‘ اسے دیکھیں اور اس کی ویڈیوز یا اقتباسات پر داد دیں۔ خمول اور انکساری اب قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ فیس بک اور دیگر پلیٹ فارمز دراصل وہ ڈیجیٹل آئینے ہیں جہاں انسان ہر لمحہ اپنے سوشل امیج کا طواف کرتا ہے اور لوگوں کی توجہ سمیٹ کر نہال ہوتا ہے۔

خود پسندی کے اس فتنۂ عظیم پر زیب النساء مخفی (دختر اورنگ زیب عالمگیر) کا ایک واقعہ نہایت سبق آموز ہے۔ ان کے پاس چینی مٹی کا ایک نہایت نفیس اور قیمتی آئینہ تھا جو ایک روز ان کی باندی کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ باندی نے خوف اور حسرت کے عالم میں یہ مصرع پڑھا: ع

از قضا آئینۂ چینی شکست

''قسمت سے چینی آئینہ ٹوٹ گیا۔''

شہزادی زیب النساء نے جب یہ دیکھا تو نہایت تحمل اور درویشانہ شان سے جواب میں دوسرا مصرع لگایا: ع

خُوب شُد! سامانِ خُود بینی شکست

''بہت اچھا ہوا کہ خود کو دیکھنے کا سبب ہی ختم ہو گیا۔''

یعنی آئینہ ٹوٹنا افسوس کی بات نہیں بلکہ مسرت کا مقام ہے کہ اب میں بار بار اپنی صورت دیکھ کر خود بینی (اپنی ذات میں مگن ہونا) کے فتنے سے محفوظ رہ سکوں گی۔

سائبر ورلڈ دراصل اسبابِ خود بینی کا ایک جدید اور پیچیدہ مظہر ہے۔ یہاں انسان نادانستہ طور پر اپنے ہی بنائے ہوئے ڈیجیٹل بُت کی پوجا میں مصروف ہو جاتا ہے۔ وہ بڑی تگ ودو سے اپنے عکس کو سجاتا ہے' اسے سنوارتا ہے اور دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے؛ پھر اسی مصنوعی عکس کے گرد طواف کرتے ہوئے اپنی پوری توانائی صرف کر دیتا ہے۔ یہ تصویری دنیا انسان کو ایک ایسے نفسیاتی خول میں بند کر دیتی ہے جہاں اسے اپنی ذات کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ صرف اپنی ستائش سننا چاہتا ہے اور اس کی تڑپ ہوتی ہے کہ کائنات کی تمام نگاہیں اسی کے وجود پر مرکوز رہیں۔

اس مہلک کیفیت کا سب سے مؤثر اور فطری علاج یہ ہے کہ آدمی اپنے ذوق اور طبع میں گمنامی کو جگہ دے۔ شہرت کی ہوس سے دامن بچانا اور گوشہ نشینی کو ایک الٰہی نعمت تصور کرنا ہی وہ ڈھال ہے جو انسان کو خود پرستی سے بچاتی ہے۔

اگر باری تعالیٰ اپنی حکمت سے کسی کو کسی بڑے مقصد کے لیے منتخب فرما لے' یا مستند اکابر کوئی بھاری ذمہ داری تفویض کر دیں' تو وہ ایک انتظامی ضرورت ہے؛ لیکن خود سے آگے بڑھنا' اپنی ذات کو پیش کرنا اور خود کو مرکزِ نگاہ بنانا نفس کے لیے ایسا زہر ہے جو انسان کی روحانیت کو آہستہ آہستہ فنا کر دیتا ہے۔ سلامتی کا راستہ صرف یہی ہے کہ انسان خود نمائی سے گریز کرے۔ بندگی کا اصل مزاج یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی کو اپنے بڑوں (اکابر و مصلحین) کے تابع کر دے۔ وہ کچھ کرے تو ان کے ایماء پر' اور اگر وہ خاموش رہنے کا اشارہ کریں تو خاموشی ہی کو اپنی معراج سمجھے۔ یہی وہ تفویض اور تسلیم ہے جو ایک عام انسان کو بندۂ حق کے مرتبے پر فائز کرتی ہے۔

جو شخص خود کو ایک خود مختار وجود (autonomous being) تصور کر کے زندگی کا ہر فیصلہ محض اپنی عقل اور مرضی کی بنیاد پر کرتا ہے' وہ بالآخر شدید ذہنی دباؤ (depression) اور پچھتاوے کا شکار ہو جاتا ہے۔ عصرِ حاضر میں نوجوانوں کے لیے زندگی کا اہم ترین موڑ ازدواجی زندگی کا انتخاب ہے۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ پسند کی شادی کی ناکامی انسان کو اس لیے زیادہ توڑ دیتی ہے کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس فیصلے کا تمام تر بوجھ اس کی اپنی ذات پر تھا۔ اس کے برعکس' بڑوں کے مشورے اور مرضی سے طے پانے والے رشتے میں اگر کوئی تلخی آ بھی جائے' تو انسان کو یہ نفسیاتی سہارا میسر ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ بڑوں کا تھا۔ یہی احساس اسے اندرونی طور پر ٹوٹنے سے بچاتا اور مضبوط رکھتا ہے۔ مشہور مفکرہ Hannah Arendt نے اسی انسانی نفسیات کی کیا خوب ترجمانی کی ہے:

"We can't bear the agony of freedom."

''ہم آزادی کی اذیت برداشت نہیں کر سکتے۔''

جب فیصلے کی مکمل ذمہ داری فرد کے کندھوں پر ہوتی ہے' تو وہ اس بوجھ تلے دب کر بکھرنے لگتا ہے۔ سلامتی اور سکون صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان خود کو بڑوں کی فکری و سماجی حفاظت میں دے دے۔ دین اسلام جس شخصیت کی آبیاری کرتا ہے' اس کا حسن ہی یہ ہے کہ آدمی گمنام رہنے کو شہرت پر ترجیح دے اور اپنے نفس کی بڑائی سے بچے۔ اسلاف نے ''کتاب التواضع والخمول'' جیسی تصانیف اسی لیے رقم کیں تاکہ انسان کو سکھایا جا سکے کہ 'خمول' (گمنامی) نفسانی آلودگیوں سے بچنے کی بہترین ڈھال ہے۔ جو شہرت کے پیچھے دوڑتا ہے' وہ نادانستہ طور پر اپنے ہی نفس کی پرستش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آج سوشل میڈیا نبوی انتباہ کا زندہ مظہر بن چکا ہے۔ جب انسان علم یا عمل کو محض لوگوں کی توجہ سمیٹنے (يَصْرِفَ بِهِ وُجُوهَ النَّاسِ إِلَيْهِ) کا ذریعہ بنا لے' تو وہ حُبِّ جاہ اور حُبِّ مال کے اس شکنجے میں کسا جاتا ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے دین کی بربادی کے لیے ''دو بھوکے بھیڑیوں'' سے تشبیہ دی ہے۔ ان تمام فکری و نفسیاتی فتنوں سے بچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم اپنے وجود کو کلمۂ توحید کی مرکزیت میں لائیں اور اپنی مستند علمی روایت سے جڑے رہیں۔ جب تک ہماری جڑیں اپنی اصل سے پیوستہ ہیں' ہم جدیدیت کے ان طوفانوں میں بھی ثابت قدم رہ سکتے ہیں۔ ❁❁❁

محترم اُستاد پروفیسر حافظ احمد یارؒ کی دس سالہ محنت کا نچوڑ
علومِ قرآنیہ پر انمول کتاب
''لغات و اعرابِ قرآن'' کی روشنی میں
''ترجمۂ قرآن کی لغوی اور نحوی بنیادیں''
اور
محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے مطالعہ قرآن کے منتخب نصاب کی تدریس باعتبار
اللغة، الرسم، الاعراب، الضبط، النحو، الصّرف، التركيب و التحليل
درج ذیل ویب سائٹ اور موبائل ایپلی کیشن (ایپ) میں دستیاب ہے
Website: www.hafizahmedyar.com
Android Mobile App Name:
Lughat o Aerab e Quran
QR CODE:
Apple Appstore App Name:
Professor Hafiz Ahmed Yar
QR CODE:
IT Section, ITRS, Markazi Anjuman Khuddam ul Quran

تعلیم کے اوّلین اُصول (۳)

First Principles of Education

از: ڈاکٹر محمد رفیع الدین

مترجم: پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف اعوان

اوپر دیے گئے ڈیوی (کی کتابوں) سے اقتباسات واضح کرتے ہیں کہ اُس کے مطابق (اور یہاں ڈیوی مکمل طور پر درست ہے) کسی طبقے کا نصب العین اپنے افراد کے عقائد' مقاصد' خواہشات' توقعات' اُمیدوں' معیارات' جذباتی اور علمی میلانات' آراء' رسموں' ارادوں' رویوں' مطالبات' اہداف' دلچسپیوں' نفرتوں اور رغبتوں' پسندیدہ اور ناپسندیدہ چیزوں اور ردّ و قبول کے میلانات سے اپنے آپ کا اظہار کرتا ہے۔ یہ واضح ہے کہ کسی سماجی نصب العین کے اِن نفسیاتی مظاہرات میں سے ہر ایک کسی ایسے تصور کا نتیجہ ہوتا ہے جو سماجی طبقے کے لیے اِس اَمر کا معیار ٹھہرتا ہے کہ اَچھا کیا ہے اور برا کیا ہے' سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے' خوش نما کیا ہے اور بدنما کیا ہے! دوسرے لفظوں میں کسی طبقے کا سماجی نصب العین کسی ایسی شے کا تصور ہوتا ہے کہ جس کے ساتھ سماجی طبقہ حسن' اَچھائی' نیز سچائی کی خوبیاں منسوب کرتا ہے اور غلط یا صحیح (بہرحال) اِس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اِس میں یہ خوبیاں بدرجۂ اَتم موجود ہیں۔ یہی یقین ہے جو ایک طبقے کے افراد کو جوڑ کر رکھتا ہے اور اُن کی سماجی زندگی کو ممکن بناتا ہے۔ اِس بات کے پیشِ نظر ہم یہ توقع رکھ سکتے تھے کہ کسی نصب العین کی تعلیمی قدر و قیمت کی جانچ کے لیے کوئی پیمانہ ایجاد کرتے ہوئے ڈیوی خود اپنے ہی قائم کردہ قضیوں سے اِس نتیجے پر پہنچتا کہ اِس کی قدر و قیمت کی پیمائش اُسی خاص سطح کی ہو سکتی ہے جس سطح کی کوئی نصب العین حسن' خیر اور صداقت کی خوبیاں رکھتا ہے' اور ایک ایسا نصب العین جو بدرجۂ اَتم اِن خوبیوں کا حامل ہو وہی تعلیمی لحاظ سے بہترین ہوگا۔ تاہم بدقسمتی سے ڈیوی خود اپنے ہی فرضیے کے مضمرات کو نہ سمجھ سکا اور کسی نصب العین کی جانچ کے لیے ایک ایسا پیمانہ تجویز کر دیتا ہے جس کی اُس کے اساسی نظریۂ تعلیم سے کوئی مناسبت نہیں۔ اُس کے نزدیک یہ پیمانہ دو پہلوؤں پر مشتمل ہے:

(۱) وہ مشاغل کتنے کثیر التعداد اور متنوع ہیں جن میں لوگ دانستہ شرکت کرتے ہیں؟

(۲) رفاقت کی دیگر صورتوں کے ساتھ کتنا بھرپور اور آزادانہ ربط و ضبط ہے؟

ڈیوی کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بہترین سماجی نصب العین اُس طبقے کا ہے جس کے افراد دانستہ طور پر زیادہ سے زیادہ مشاغل میں ایک دوسرے کو حصے دار بناتے ہیں اور جو (طبقہ) دیگر طبقوں کے ساتھ بہت زیادہ تعاون پر

مبنی رابطہ رکھتا ہے۔ یہ اَمر واضح ہے کہ اُس کی کسوٹی کے اِن دو عناصر میں سے کوئی بھی عنصر کسی نصب العین کی قدر و قیمت کو ظاہر نہیں کر سکتا۔

آغاز پہلے عنصر کی جانچ پرکھ سے کرتے ہیں۔ فرض کریں ایک خاص رنگ کے افراد ایک خاص نسل سے تعلق رکھنے والے ایک خاص زبان بولنے والے اور مخصوص جغرافیائی حدود کے اندر رہنے والے لوگ ایک غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو سچے دِل سے یہ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں کہ وہ دنیا کی ایسی بہترین مخلوق ہیں جس کا یہ حق ہے کہ دنیا کی بھلائی کی خاطر دوسرے انسانوں کی قیمت پر زندہ رہیں' نشوونما پائیں' پھلیں پھولیں اور اپنی نسل میں اضافہ کریں' تاکہ خدا کی زمین انسانیت کی بہترین نسلوں سے جتنا جلد ممکن ہو آباد ہو جائے۔ ایسے لوگوں کے اَمن اور خوش حالی کا ایک زمانہ ہوتا ہے جس کے دوران میں وہی سائنس اور ٹیکنالوجی (کے علوم) میں ترقی کرتے ہیں اور دوسری سرزمینوں پر حملہ آور ہونے اور (انہیں) زیر کرنے کے لیے دھاوا بولنے والے طاقت وَر ہتھیار بناتے ہیں' اور ایسا وہ مفتوح سرزمینوں کے باشندوں کو مغلوب کرنے اور غلام بنانے کے لیے' لوٹنے اور اُن کا استحصال کرنے کے لیے' مادی اور ثقافتی طور پر انہیں کنگال کرنے کے لیے کرتے ہیں' یہاں تک کہ وہ تباہ و برباد ہو جائیں اور اپنے وطن فاتحین کے حوالے کر دیں۔ وہ اِس نوع کے دھندوں میں صدیوں کامیاب ہوتے رہتے ہیں۔ سب اَچھے لوگوں کے نقطۂ نظر کے مطابق بلاشبہ یہ تہذیب یافتہ ڈاکوؤں کے ایک طبقے کا انسانی برادری کو ایک وسیع پیمانے پر مہارت سے قتل کرنے اور لوٹ کھسوٹ کرنے کی ایک طویل کارروائی ہے۔

اگر دنیا کے اِن دیانت دار مگر گمراہ خیر خواہوں کا یہ طبقہ حقیقتاً اپنے نصب العین سے محبت کرتا ہے اور توسیع کے اُس پروگرام کو آگے بڑھانا چاہتا ہے جو اِس کا تقاضا ہے تو وہ اِس اَمر کی کوشش کرے گا کہ کامیابی کے ساتھ اپنی ہم آہنگی' اتحاد اور استحکام کی سطح کو جس حد تک ممکن ہو قائم رکھے۔ چنانچہ اُن کی خواہش ہوگی کہ مقاصد اور مختلف النوع مشاغل کا زیادہ سے زیادہ تعداد میں آپس میں تبادلہ کریں۔ اُن کی یہ خواہش اپنے مشترکہ نصب العین سے اُن کی محبت کے باعث بِلا مزاحمت آسانی سے پوری ہو جائے گی۔ اُن کے مشاغل' اہداف اور مقاصد ایک جیسے اور یکساں ہوں گے' کیوں کہ وہ سب ایک ہی نصب العین کی پیداوار ہیں۔ تاہم کیا یہ اَمرِ واقعہ اِس بات کی علامت ہوگا کہ اُن کا نصب العین قدر و قیمت کا حامل اور بجا طور پر تعلیمی افادیت کا حامل ہے؟

ڈیوی اِس موقف کی حمایت کرتا ہے اور یوں اپنی ہی تردید کرتا ہے اور اپنے ہی قائم کردہ معیار کی نفی کر دیتا ہے جب وہ کہتا ہے:

> ''جتھوں کی نشان دہی' برادرانہ احساسات اور چھوٹے گروہوں کی نشان دہی اپنے ضابطوں سے شدید وفاداری سے ہوتی ہے۔ خاندانی زندگی کی نشان دہی خاندان سے باہر کے لوگوں سے امتیاز' بدگمانی اور حسد سے ہوتی ہے' تاہم اِس کے باوجود (خاندانی زندگی) اندر سے محبت اور باہمی اعانت کا نمونہ ہوتی ہے۔ افراد کی کوئی جماعت جو بھی تعلیم دیتی ہے اِس کے اندر اپنے افراد کو اپنے رنگ میں رنگنے کا رجحان ہوتا ہے' تاہم اِس میل جول کی قدر و قیمت اور خوبی کا انحصار جماعت کے مقاصد اور عادات پر ہے۔''

وہ اِس سے زیادہ صاف لفظوں میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ کسی سماج کی قدر و قیمت کا جائزہ اِس بات سے قطعاً نہیں لیا جائے گا کہ اس کے افراد کے مشترکہ مفادات کی تعداد یا انواع کیا ہیں' بلکہ اِس اَمر کا فیصلہ اِس کے اخلاقی وصف یا اِس کے مقاصد اور نصب العینوں کے حسن' اچھائی اور صداقت کے معیار سے ہوگا۔ یقیناً اگر کسی طبقے کے مفادات جو کہ بلاشبہ اس کے مقصد سے اَخذ شدہ یا ہم آہنگ ہوتے ہیں' پست اور گھٹیا ہوں تو وہ صرف اِس وجہ سے قابلِ قدر نہیں ہوسکتے کہ اِن (مفادات) کی ایک بہت بڑی تعداد اِس (طبقے) کے افراد کی مشترکہ ملک ہیں۔

اِسی طرح کا معاملہ ڈیوی کے قائم کردہ معیار میں دوسرے عنصر کے ساتھ بھی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ڈیوی یہ سوچتا ہے کہ تعلیم چوں کہ ایک سماجی عمل ہے اِس لیے وہ سماجی طبقہ ہی بہترین تعلیم فراہم کرنے کی اہلیت رکھتا ہے جو بحیثیت مجموعی کسی سماجی طبقے کو دیگر سماجی طبقوں کے ساتھ خارجی سماجی میل ملاپ کے بہترین مواقع فراہم کرتا ہے۔ تاہم بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اُس نے اِس سے قبل اپنی کہی ہوئی اِس بات کو نظرانداز کر دیا کہ اُس سماجی عمل کا جسے ہم تعلیم کہتے ہیں' مقصدِ وحید کسی سماجی طبقے کے عقائد اور نصب العینوں کو نسلِ نو تک منتقل کرنا ہے۔ اِس عمل کو شروع کرنے والی اور برقرار رکھنے والی قوت وہ جذبۂ محبت ہے جو ایک سماجی طبقہ اپنے نصب العین کے ساتھ رکھتا ہے۔ یوں یہ عمل صرف اِسی جذبۂ محبت کی خدمت گزاری میں اور اِس کی قائم کردہ حدود کے اندر عمل کرتا اور فروغ پاتا ہے۔ کسی سماجی گروہ کا دوسرے سماجی گروہوں کے ساتھ میل ملاپ یا باہمی تعاون چاہے کتنا ہی بھرپور اور آزادانہ کیوں نہ ہو' ہمیشہ اپنے نصب العین کے تقاضوں کے تابع ہوتا ہے۔ چنانچہ اِس (میل ملاپ اور باہمی تعاون) کا معیار اور نتیجہ اِس (گروہ) کے اپنے حق میں اور دیگر سماجی گروہوں کے حق میں کیا ہوتا ہے' اِس بات کا انحصار اُس نصب العین کے اخلاقی معیار پر ہوتا ہے۔ ایک سماجی طبقے کا وجود اس حقیقت سے منسلک ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص نصب العین کے مکمل طور پر خیر' حسن اور صداقت پر مبنی ہونے پر یقین رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ یہ دیگر سماجی طبقوں کے ساتھ بھرپور اور آزادانہ میل ملاپ یا باہمی تعاون کے باوجود اُن سے کچھ سیکھے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں اُن (دیگر طبقوں) کے پاس بھلا اِس کے اپنے نصب العین سے بڑھ کر حسن' خیر اور صداقت کی صورت کیا ہوسکتی ہے کہ اُن سے کچھ سیکھا جائے!

یہ زیادہ سے زیادہ اُن سے اپنے پہلے سے قائم کیے ہوئے عقائد اور نصب العینوں کو پورا کرنے کے نئے طریقے سیکھ سکتا ہے' جیسے کہ یہ عام طور سے فطرت کے مطالعے سے بھی سیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ دیگر طبقوں کے ساتھ اِس کا میل ملاپ اور ربطِ باہمی کبھی بھی مکمل طور پر بھرپور اور آزادانہ نہیں ہوتا۔ اِس پر ہمیشہ خفیہ تحفظات اور توقعات کا پہرا ہوتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اِس (میل ملاپ) کے پیچھے دوسرے طبقوں کے نصب العینوں کے لیے (دل میں) پوشیدہ نفرت بلکہ دشمنی ہوتی ہے۔ اگر ایک سماجی طبقے کا نصب العین گھٹیا اور پست ہے تو اِس کا دیگر سماجی طبقوں کے ساتھ میل ملاپ یا تعاونِ باہمی ہم چاہے کتنا ہی بھرپور اور آزادانہ تصور کرلیں' دوسروں کے لیے ضرر رساں اور صرف اپنے اہداف کی تحصیل کے لیے ہوگا' اور واحد فائدہ جو اس (گھٹیا اور پست نصب العین کے

حامل سماجی طبقے) سے دوسرے سماجی طبقوں کو مل سکتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ سماجی طبقہ دوسرے سماجی طبقوں کو نقصان نہ پہنچائے جب کہ اِس کام سے یہ اپنے آپ کو روک نہیں سکتا۔ یوں ایک ایسے سماجی طبقے کے لیے‘ جس کی مثال اوپر دی جا چکی ہے‘ اپنے نصب العین کی تحصیل کے لیے یہ اَمر ناگزیر ہوگا کہ اپنی کارگزاری اور قوت کے لیے نہ صرف مکمل داخلی ہم آہنگی اور مفادات کے ربط وضبط کو قائم رکھے بلکہ اُن دیگر سماجی طبقوں کے ساتھ بھی خاطر خواہ تعاونِ باہمی پیدا کرے جو عنقریب اِس کے جھانسے میں آنے والے ہیں‘ تاکہ اُن سے معاشی مفادات حاصل کیے جائیں‘ نیز اُن کو زیادہ سے زیادہ سمجھنے کا موقع ملے۔ یہ (گھٹیا اور پست نصب العین کا حامل سماجی طبقہ) اِس قِسم کے میل ملاپ کے نتیجے میں جتنا زیادہ انہیں جاننے اور انہیں سمجھنے کا اہل ہوگا اتنی ہی بہتر اہلیت کے ساتھ اُن کا استحصال کرے گا اور انہیں فرضی انسانی فلاح کے نام پر کچل کر رکھ دے گا۔ چنانچہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر ایک نصب العین دوسرے سماجی طبقوں کے ساتھ راہ ورسم کا تقاضا کرتا ہے تو ضروری نہیں کہ یہ اِس کے قابلِ قدر ہونے کا اشارہ ہو۔ اس (نصب العین کے حامل سماجی طبقے) کو اپنی قوتوں کی نشوونما کے لیے بہر صورت اِن باہمی رابطوں کی ضرورت ہے۔ اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ اِس کا (نصب العین) قابلِ قدر ہے یا نہیں ہے‘ اَچھا ہے یا برا ہے‘ سچا ہے یا جھوٹا ہے‘ درست ہے یا غلط ہے۔ ڈیوی مزید لکھتا ہے:

’’ہمارے معیار میں مذکور دونوں عناصر جمہوریت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔‘‘

اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ درحقیقت اِن میں سے کوئی بھی (عنصر) کسی خاص نصب العین کی نشان دہی نہیں کرتا۔ تاہم اگر مناسب طریقے سے دیکھا جائے تو وہ کسی سماجی نصب العین کی دو خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو کہ عمومی اور تمام سماجی نصب العینوں میں یکساں ہیں‘ یعنی (کسی نصب العین کا) اَچھا یا برا ہونا‘ قابلِ قدر ہونا یا نا قابلِ قدر ہونا۔ ایک سماجی طبقہ چاہے یہ جمہوریت‘ آمریت یا بادشاہت کے نام سے موسوم ہو‘ اپنی فطری صنعت اور اُن قوانین کی رو سے جو اِسے تخلیق کرتے اور قائم رکھتے ہیں‘ اِس اَمر کا رجحان رکھتا ہے کہ داخلی طور پر متجانس ہو جائے۔ نیز یکساں مقاصد کے پیشِ نظر اپنے افراد کو اِس بات پر راغب کرے کہ آپس میں جس حد تک ممکن ہو‘ مفادات کی تعداد اور اِن کی مختلف صورتوں کا تبادلہ کریں۔ گویا یہ (سماجی طبقہ) ایسا (معاشرہ) بن جانے کی طرف مائل ہوتا ہے کہ جس میں عوام کی حکومت‘ عوام کے ذریعے اور عوام کے لیے ہو۔ جمہوریت‘ آمریت اور بادشاہت تو محض مختلف شکلیں ہیں جس میں یہ میلان زیرِ عمل آتا ہے۔ آیا یہ کامیابی کے ساتھ عملی صورت اختیار کرے گا یا نہیں‘ اِس کا انحصار اتنا حکومت کی اُس ہیئت پر نہیں ہے کہ جس کے ذریعے یہ زیرِ عمل آتا ہے جتنا کہ اُس قیادت کے معیار پر ہے جو اِس کے عملی اطلاق کے لیے اقدامات کرتی ہے۔ ایک ایسی حکومت جو بعض آداب و رسوم کی پاس داری کے نتیجے میں بزعمِ خویش جمہوری ہونے کی دعوے دار بنتی ہے‘ اُس کے متعلق گمان ہوتا ہے کہ وہ اِسے عوام کی حکومت‘ عوام کے ذریعے اور عوام کے لیے بنائے گی۔ تاہم ہوسکتا ہے کہ وہ قطعاً ایسی حکومت نہ ہو جب کہ ایک آمرانہ حکومت چاہے وہ اِن آداب ورسوم کی مظہر نہ ہو‘ ایسی حکومت (کہلانے کی مستحق) ہوسکتی ہے۔ ایسی حکومت کے ماتحت افراد کے مشترکہ مفادات اُس جمہوری حکومت کی نسبت کہیں زیادہ اور متنوع ہوسکتے ہیں

جس پر ڈیوی کی جمہوریت کی تعریف کا اطلاق ہوتا ہے۔ اِسی طرح ایک سماجی گروہ چاہے اپنے آپ کو جمہوری کہلاتا ہے یا نہیں‘ دوسرے گروہوں کے ساتھ اتنے ہی بھرپور اور آزادانہ میل ملاپ کا میلان رکھتا ہے جتنا کہ اِس کا نصب العین اِسے اجازت دیتا ہے‘ تاکہ اپنے مفادات کو آگے بڑھانے اور ترقی دینے کے قابل ہو سکے۔

ڈیوی بعض اوقات جمہوریت پر گفتگو ایک سماجی نصب العین کے طور پر اور بعض اوقات سماجی نصب العین کی تکمیل کے لیے ایک سماجی طرزِ حیات کے طور پر کرتا ہے اور اکثر گول مول الفاظ میں دونوں کو ایک جیسا سمجھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت کُلّی طور پر ایک سماجی نصب العین نہیں ہے۔ یہ نصب العین کا صرف وہ حصہ ہے جس کا تعلق اُس طرزِ حکومت سے ہے جو کہ ایک سماجی طبقہ اپنے نصب العین کی تکمیل کے لیے اختیار کرتا ہے۔

کسی سماج کا احوال بیان کرنے کے لیے یہ کہہ دینا کہ وہ جمہوری ہے‘ کافی نہیں۔ مزید برآں ہمیں یہ بتانا پڑے گا کہ وہ نصب العین کیا ہے جو اس نے جمہوری طرزِ حکومت کے ذریعے حاصل کرنے کے لیے اختیار کیا ہے۔ ہمارے اپنے زمانے میں تمام جمہوریتیں قومی ریاستیں ہیں اور اِن میں سے ہر ایک کا نصب العین کسی نوع کی قومیت ہی ہے‘ مثلاً امریکی قومیت‘ فرانسیسی قومیت‘ اطالوی قومیت اور انگریز قومیت‘ جس کا مطلب یہ ہے کہ اِن میں سے ہر ایک کا مقصد اُس خاص قوم کے مفادات کو تحفظ دینا اور ترقی دینا ہے جس کے ساتھ یہ اپنی شناخت کراتی ہے۔ آیا ایک جمہوری معاشرہ ایک ایسا سماجی ماحول مہیا کرنے کے اہل ہوتا ہے کہ جو بہترین معیار کی تعلیم دینے کے لیے ضروری ہے۔ اس بات کا انحصار اس اَمرِ واقعہ پر ہے کہ آیا اِس کا نصب العین تعلیمی لحاظ سے بہترین معیار کا ہے یا نہیں! کیا قومیت (Nationalism) اِس نوع کا نصب العین ہے؟ ڈیوی محسوس کرتا ہے کہ نہیں ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ (قومیت کا تصور) اِس قدر تنگ دامن اور محدود ہے کہ تعلیمی افادیت کا حامل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

> ”کسی جمہوری معاشرے میں تعلیم کے بنیادی مسائل میں سے ایک مسئلہ وہ ہے جو قومی اور وسیع تر سماجی مقصد کی آویزش کا پیدا کردہ ہے ...... یورپ میں خاص طور پر براعظمی ریاستوں میں انسانی فلاح اور ترقی کے لیے تعلیم کی اہمیت کے نئے تصور کو قومی مفادات نے گرفت میں لے لیا اور اِسے ایک ایسا کام کرنے کے لیے بروئے کار لایا گیا جس کا سماجی مقصد یقیناً وسعتِ نظری سے عاری اور جاہ پسندانہ تھا۔ تعلیم کے سماجی مقصد اور اِس کے قومی مقصد کو ایک ہی سمجھ لیا گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ سماجی مقصد کا معنی ومفہوم بہت زیادہ دھندلا گیا۔ یہ بدحواسی انسانی میل جول کی موجودہ صورتِ حال کے مطابق ہے۔ ایک طرف تو سائنس‘ کامرس اور صنعت وحرفت قومی جغرافیائی حدود سے آگے نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور دوسری طرف سیاست کے میدان میں قومی خودمختاری کے تصور پر اتنا زور کبھی نہیں دیا گیا جتنا کہ موجودہ دور میں یہ تصور شدید صورت اختیار کر گیا ہے۔ (مفادات کا) یہ تصادم (فلسفۂ) تعلیم کی پرکھ اور تفاعل کے لحاظ سے تعلیمی نظریے کے سماجی معنی ومفہوم کا اَب تک حاصل ہونے والے تصورات کی نسبت زیادہ واضح تصور کا تقاضا کرتا ہے۔“

نیز (اِس جمہوری سماج میں) یہ بھی کمی ہے کہ اِس کا قومی وفاداری اور حب الوطنی کا جذبہ اُن بلند و بالا اعتقادات سے مناسب موافقت نہیں رکھتا۔ (اعتقادات) لوگوں کو قومی سیاسی جغرافیائی حدود سے قطع نظر مشترکہ

مقاصد بندھن میں باندھ دیتے ہیں۔ چنانچہ ڈیوی ایک سوال کرتا ہے:

''کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی قومی ریاست ایک نظامِ تعلیم کو چلائے اور پھر بھی اُس کے تعلیمی عمل کے مجموعی سماجی مقاصد میں کمی نہ آئے' (وہ) تفریط کا شکار نہ ہوں اور اُن کا حلیہ نہ بگڑے؟''

ڈیوی اِس سوال کا جواب تو ''ہاں'' میں دیتا ہے مگر ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ وہ اپنے اِس نتیجے تک کیسے پہنچا! قومی نصب العین کی ماہیت میں وہ کون سے حقائق ہیں جو تعلیمی عمل کے وسیع تر سماجی اہداف کے ساتھ موافقت پیدا کر لینے کے امکان کی جانب اشارہ کرتے ہیں؟ تاہم وہ اِس بات کا بھی ذکر کرتا ہے کہ اِس امکان کے پورا ہونے کے راستے میں کچھ داخلی اور خارجی مشکلات ہیں اور حقیقت میں یہ مشکلات اِس حد تک نا قابلِ گرفت ہیں کہ اُس کے جواب کو ''ہاں'' سے ''ناں'' میں بدل دیتی ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

''داخلی طور پر اِس سوال کو موجودہ اقتصادی صورت احوال کے باعث ایسے میلانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو معاشرے کو طبقات میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اِن میں سے کچھ (طبقات) کو دیگر (طبقات) کی بلند تر ثقافت کا محض آلہ کار بنا دیا جاتا ہے۔ خارجی سطح پر اِس سوال کا تعلق اِس بات کے ساتھ ہے کہ قومی وفاداری نیز حب الوطنی کے جذبے کی برتر وابستگی کے حامل ایسے جذبوں کے ساتھ موافقت پیدا کی جائے جو لوگوں کو مشترکہ مقاصد کے بندھن میں باندھ دیں' قطع نظر اس بات کے کہ اُن کی قومی سیاسی جغرافیائی حدود کیا ہیں۔''

یہاں ڈیوی اپنے ایک اور ابتدائی بیان کی تردید کرتا ہوا نظر آتا ہے (اُس نے کہا تھا کہ کسی سماج کی قدر و قیمت کی جانچ کے لیے اُس کے پیمانے کے دونوں عناصر یعنی داخلی سماجی طبقے کے مفادات نیز دوسرے گروہوں کے ساتھ خارجی تعاون پر مبنی میل جول' جمہوریت کی جانب اشارہ کرتے ہیں)۔ اگر ایک جمہوری سماج کو اِس وجہ سے اصلاح کی ضرورت ہے کہ یہ ایسے طبقات میں منقسم ہوتا ہے جن میں سے کچھ کو دوسرے طبقوں کی بلند تر ثقافت کا محض آلۂ کار بنا دیا جاتا ہے' نیز اِن طبقات کا قومی وفاداری اور حب الوطنی کا جذبہ اُن بلند و بالا اعتقادات سے مناسب موافقت نہیں رکھتا جو (اعتقادات) لوگوں کو قومی سیاسی جغرافیائی حدود سے قطع نظر مشترکہ مقاصد کے بندھن میں باندھ دیتے ہیں تو (اِس صورتِ حال میں) یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ ایک جمہوری سماج کس معنی و مفہوم میں ''مفادات کی داخلی یکسانیت'' اور ''دوسرے گروہوں کے ساتھ تعاون پر مبنی میل ملاپ'' کا حامل ہو سکتا ہے؟ نیز یہ کہ کسی سماج کی قدر و قیمت کے ڈیوی کے پیمانے پر یہ دو عناصر کس معنی و مفہوم میں کسی اور طرح کے سماج کی جانب نہیں بلکہ صرف جمہوریت کے حامل سماج کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

وہ قومی نصب العین کی داخلی اور خارجی کوتاہی کے علاج کے طور پر تجویز کرتا ہے کہ:

''اسکول میں فراہم کی جانے والی سہولیات لازمی طور پر اتنی وافر اور موثر ہونا چاہئیں کہ وہ نام کو نہیں بلکہ حقیقت میں اقتصادی ناہمواری کو ختم کر دیں اور قوم کے تمام بچوں کو اُن کے مستقبل کی ترقی و نشوونما کے لیے ایک جیسے لوازمات مہیا کریں .... اس مقصد کی بجا آوری تقاضا کرتی ہے .... ثقافت کے روایتی نصب العینوں میں اصلاح۔ یہ کافی نہیں کہ جنگ کی ہولناکیاں ذہن نشین کر دی جائیں اور ہر اُس بات سے

بچا جائے جو بین الاقوامی حسد اور عداوت (کے جذبات) کو اُبھارے۔ ایسی باتوں پر زور دینا لازمی ہوگا کہ جس کے نتیجے میں لوگ جغرافیائی حدود سے نکل کر انسانی جِدّوجُہد کے عمل میں باہمی اعانت کے بندھن میں بندھ جائیں۔ تمام انسانوں کی ایک دوسرے کے ساتھ بھرپور‘ آزادانہ اور زیادہ بارآور رفاقت نیز میل جول کے مقابلے میں قومی فرماں روائی کی ثانوی اور وقتی حیثیت کو لازمی طور پر کارگزار ذہنی خصلت (working disposition of mind) کے طور پر ذہن نشین کرایا جائے۔‘‘

ڈیوی اوپر والے بیان میں جو کہنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ قومی نصب العین لازمی طور پر یوں مناسب طریقے سے بدل دیا جائے کہ یہ ایک ایسا آفاقی ہمدردیوں والا نصب العین بن جائے جو درونِ خانہ طبقاتی تعصّبات سے اور ملک سے باہر جغرافیائی سرحدوں کے تعصّبات سے بالاتر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تجویز کرتا ہے کہ معتقدات کے بہت سے ایسے عناصر کو قومی نصب العین میں شامل کیا جائے جنہیں اَب تک اِس میں شامل کرنا گوارا نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ اَمر فطری طور پر معتقدات کے اُن عناصر کے اخراج کا باعث بنے گا جو اِن کی ضد ہیں۔

معتقدات کے وہ نئے عناصر جن کے بارے میں اُس کا یہ خیال ہے کہ انہیں لازمی طور پر قومی نصب العین میں شامل کیا جائے‘ نیز انہیں ’’افراد کی کارگزار خصلت‘‘ بنایا جائے‘ حسبِ ذیل ہیں:

(۱) بین الاقوامی حسد بُری بات ہے۔

(۲) بین الاقوامی عداوت بُری بات ہے۔

(۳) باہمی تعاون پر مبنی انسانی جِدّوجُہد کی صورتیں اور اُن سے حاصل کردہ نتائج اچھی چیز ہے۔

(۴) قومی وفاداری یا حب الوطنی اِس صورت میں بری چیز ہے اگر یہ اوپر بیان کردہ اِس نوع کے مشاغل اور نتائج کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

(۵) قومی خودمختاری محض ثانوی اور مشروط اہمیت رکھتی ہے۔

(۶) اوّلین اور غیر مشروط اہمیت تمام انسانوں کی ایک دوسرے کے ساتھ میل ملاپ کو حاصل ہے۔

(۷) قومی خودمختاری اِس صورت میں بری چیز ہے اگر یہ تمام انسانوں کے ایک دوسرے کے ساتھ آزادانہ میل ملاپ کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔

ڈیوی کا یہ خیال ہے کہ معتقدات کے اِن عناصر کو قومی نصب العین میں شامل کرنے کے بعد اور مخالف عناصر کو اِس سے خارج کرنے کے بعد قومی نصب العین پھر بھی قومی نصب العین ہی رہے گا‘ تاہم حقیقت یہ ہے کہ یہ اضافے اور اِن ہی کی مناسبت سے اخراج لازماً قومی نصب العین کے سب حصوں کو تبدیل کر دے گا۔ اس کے اُن حصوں کو بھی تبدیل کر دے گا جنہیں بظاہر چھوا بھی نہیں گیا ہے اور (یوں یہ جمع وتفریق کا عمل) اِسے ایک نئے نصب العین میں بدل دے گا۔ وجہ یہ ہے کہ نصب العین ایک ایسا عضوی کُل ہوتا ہے جس کا ہر حصہ ہر دوسرے حصے سے مربوط اور اَثر پذیر ہوتا ہے‘ چنانچہ جمع وتفریق کی نئی صورتوں کے تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اِس کے ہر حصے کو بدلنا پڑتا ہے۔ یوں نصب العین ایک ایسا نیا کُل بن جاتا ہے جو مکمل طور پر پرانے کُل کی جگہ لے لیتا

ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دونوں نصب العین‘ نیا اور پرانا‘ بظاہر ایک جیسے معلوم ہوں مگر عملاً وہ ایک دوسرے سے کُلی طور پر مختلف ہو جاتے ہیں۔

اسکول کی تعلیم کے ذریعے کارگزار ذہنی خصلت کی تشکیل کے حوالے سے ڈاکٹر ڈیوی کا اپنے مذکورہ بالا بیان میں شامل نقطۂ نظر واضح طور پر اُس کے ابتدائی نقطۂ نظر کی تردید کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ افتادِ طبع کا اصل تار و پود اسکول کی تعلیم سے بے تعلق سماجی پسندیدگی کے حامل اُن عقائد و اعمال کے براہِ راست یا غیر شعوری اَثر سے بنتا ہے جو سماجی نصب العین سے مربوط ہوتے ہیں۔ نیز اُن عقائد و اعمال کے براہِ راست یا غیر شعوری اثر سے بنتا ہے جو سماجی نصب العین سے مربوط ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اُن عقائد و اعمال کی ناپسندیدگی سے بنتا ہے جو سماجی نصب العین سے غیر مربوط ہوتے ہیں۔ اُس کا کہنا تھا کہ شعوری اور بالارادہ تدریس زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہے کہ یوں تشکیل پانے والی صلاحیتوں کو بھرپور طریقے سے عمل میں آنے کے لیے آزاد کر دے‘ انہیں کسی قدر اُن کی ناشائستگی سے پاک کر دے اور ایسے مقاصد فراہم کرے جو اُن کی سرگرمی کو زیادہ بامعنی بنا دے۔ اس سے یہ پہلو برآمد ہوتا ہے کہ صلاحیتیں یا خصلتیں بذاتہٖ اِس طرح کی تدریس سے نہیں بدلتیں۔

تاہم چلیے‘ تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ ڈیوی کا سابقہ نقطۂ نظر نہیں بلکہ وہ نقطۂ نظر جس کا اُس نے اَب اظہار کیا ہے‘ درست ہے یعنی یہ کہ اسکول کی تعلیم بنیادی طور پر بچے کی اُس خصلت کو بدل سکتی ہے جو اُس نے پہلے ہی اپنے بزرگوں کے زیرِ اَثر بنالی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسکول عقیدے کے بین الاقوامی‘ بے لوث‘ آفاقی اور اُن وسیع المشرب عناصر کی تعلیم دینے کا آغاز کیسے کرے گا جن کی ڈیوی قومیت کے پرستاروں کو سفارش کرتا ہے؟ ایسا اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اسکولوں میں ایسے اساتذہ تعینات نہ کیے جائیں جو عقیدے کے اِن عناصر پر یقین رکھنے والے ہوں۔ تاہم ایسے اساتذہ کا حصول مشکل ہو گا کہ جو بچپن ہی سے قومی نصب العین کی خدمت اور محبت کی تعلیم پانے کے باوجود سچے دل اور خلوص کے ساتھ سماجی آفاقیت اور بین الاقوامی اتحاد کی حمایت پر یقین کرنے والے بن جائیں۔ اگر ایسا فرض کر لیا جائے کہ حکومت اسکولوں کا انتظام و انصرام سنبھال لے گی اور اپنے اساتذہ کو ہدایات جاری کرے گی کہ قومی نصب العین کی بجائے بین الاقوامی اور آفاقی نصب العین کی تعلیم مہیا کی جائے تو سوال یہ پیدا ہو گا کہ کون لوگ ہوں گے جو ایسی حکومت تشکیل دیں گے‘ اور یہ کیسے ہو گا کہ وہ قومی نصب العین کی بجائے بین الاقوامی نصب العین سے محبت کرنے لگیں؟ اگر وہ عوام کے نمائندے اور منتظمین ہوں گے تو بین الاقوامیت یا دوسروں کی بھلائی کا جذبہ صرف اُن ہی کا نصب العین نہیں ہو گا بلکہ یہ ملک کے سب لوگوں کا نصب العین ہو گا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ کسی سماجی طبقے میں اسکول کی تعلیم اُس وقت تک نسلِ نو میں نصب العین کی کوئی تبدیلی نہیں لا سکتی جب تک سب سے پہلے بحیثیتِ مجموعی بالغ آبادی کے نصب العین میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

یہ نتیجہ ڈیوی کے اِس نقطۂ نظر سے مطابقت رکھتا ہے کہ تعلیمی عمل کسی سماجی طبقے کے بڑوں کے عقائد و نظریات کو اِس کے جوانوں اور نابالغ افراد کو منتقل کرنے کا نام ہے‘ اور کسی سماجی طبقے کی پسند و ناپسند وہ دو قوتیں ہیں جن کے

نتیجے میں منتقلی کا یہ عمل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ جو سماجی طبقہ قومی نصب العین سے محبت کرتا ہے اُس سے قومی نصب العین تقاضا کرتا ہے کہ اپنے جوانوں اور نابالغ افراد کے ایسے عقائد واعمال کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جو اِس کے ساتھ ہم آہنگ ہیں جبکہ اُن عقائد واعمال کے لیے ناگواری کا اظہار کرے جو اُس کی ضد ہیں۔ نتیجے کے طور پر سماجی طبقے کے یہ افراد قومی نصب العین سے بالکل اپنے بڑوں کی طرح محبت کرنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ (نصب العین) اُن کے لیے بھی اُن تمام باطنی ثمرات کا حامل ہو جاتا ہے جن باطنی ثمرات کا حامل یہ بڑوں کے لیے ہوتا ہے۔ جہاں تک نسلِ نو کا تعلق ہے‘ اگر اِس نصب العین میں کوئی تبدیلی کرنا ہے تو اِس کا اظہار سب سے پہلے سماجی طبقے کے بڑوں (کے عقائد واعمال) میں ہونا چاہیے۔ انہیں اپنے نصب العین کی اُن بعض باتوں سے‘ جن سے وہ پہلے محبت کرتے تھے‘ تنفر کا آغاز کرنا چاہیے اور اُن باتوں سے محبت کرنا چاہیے جو اُن کے نصب العین میں نہیں تھیں اور جن سے پہلے وہ نفرت کرتے تھے۔ اُن کی محبتوں اور نفرتوں‘ اُن کے عقائد ونظریات‘ اُن کے رویوں اور میلانات میں یہ تبدیلی کہاں سے آئے گی؟ یہ کیسے ممکن ہوگا کہ بڑوں کو مجبور کریں کہ بعض باتوں سے محبت کرنا اور بعض دیگر باتوں سے نفرت کرنا چھوڑ دیں؟ وہ تعلیم جو اُنہوں نے اپنے بچپن سے پائی‘ اِس اَمر کی یقین دہانی کراتی ہے کہ اُن کی موجودہ محبتیں اور نفرتیں بعینہٖ (جیسے کہ وہ ہیں) جاری رہیں گی اور کسی نئی اتنی زبردست تعلیم کے لیے کوئی اہتمام نہیں ہے کہ اِن محبتوں اور نفرتوں کو جڑ سے اُکھاڑ دے اور اِن کی بجائے نئی محبتوں اور نفرتوں کا نقش دِل میں بٹھا دے۔ چنانچہ یہ بات واضح ہے کہ قومی نصب العین کو تعلیمی لحاظ سے محکم بنانے کے لیے اس میں تبدیلی اور اصلاح کے حوالے سے ڈیوی کی تجاویز پر عمل کرنا (اتنا) آسان نہیں ہے۔ اِس اَمر کے لیے ضرورت ہے کہ پوری آبادی کی نئے سرے سے تعلیم ہو اور یہ تعلیم ایک ایسا قائد یا قائدین کی جماعت دے جو نئے عقائد سے متاثر ہو اور دوسروں میں اِن کی تحریک پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اگر وہ سب لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ بات کسی عظیم علمی انقلاب سے کم نہ ہوگی‘ جس کے بعد ایک نئی قوم ایک نئے نصب العین سے محبت کرنے اور اُسے پورا کرنے کے لیے سامنے آئے گی۔ نئے نصب العین کے بارے میں اَب مزید یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ قومیت پر مبنی ہے۔ یہ ضروری ہوگا کہ اِسے نیا نام دیا جائے تاکہ اِس کا پرانے ترک شدہ نصب العین سے فرق کیا جا سکے اور اُس ذہنیت کو خدا حافظ کہا جائے جو اِس کے نام پر فریفتہ تھی۔ مثال کے طور پر اِسے بین الاقوامیت‘ انسان دوستی یا کسی اور ایسے نظام کا نام دیا جا سکتا ہے جو اِسے زیادہ مناسب طور پر بیان کرنے کے اہل ہو۔

یہ سوچنا انتہا درجے کی سادگی ہے کہ ایک قومی ریاست ایثار پیشہ یا آفاقی نقطۂ نظر کی حامل ہو سکتی ہے‘ دوسری قوموں کے حسد یا عداوت سے مستثنیٰ ہو سکتی ہے‘ اپنے قومی مفادات کا لحاظ رکھے بغیر دوسری قوموں کے ساتھ تعاون پر مبنی اچھے تعلقات قائم رکھ سکتی ہے‘ دوسری ریاستوں کے قومی مفادات کی خاطر اپنی قومی خودمختاری‘ قومی وفاداری یا حب الوطنی کو پسِ پشت ڈال سکتی ہے اور پھر بھی اُسے ایک الگ قوم کے طور پر اپنے وجود کا بھرپور احساس رہے اور وہ اپنے قومی مفادات کا مناسب طریقے سے دھیان رکھ سکے۔ کسی سماجی نصب العین کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ بیک وقت آفاقی اور علاقائی ہو۔ ہر سماجی طبقہ (بلاشبہ جس کا وجود ہی اُس سماجی نصب العین پر

منحصر ہوتا ہے کہ جس سے یہ محبت رکھتا اور جس کی یہ خدمت بجالاتا ہے) اپنے نصب العین کی ماہیت میں راسخ کچھ ایسے مخصوص میلانات کا حامل ہوتا ہے جو اِسے ایک خاص انداز میں سوچنے‘ محسوس کرنے اور عمل کرنے پر آمادہ کرتے ہیں‘ بالکل ایسے ہی حتمی انداز میں جیسے کسی درخت پر (صرف) اُسی کا پھل لگتا ہے۔ ایک قومی ریاست کا طرزِ عمل صحیح معنوں میں اپنے نصب العین ہی سے متعین ہوتا ہے اور کوئی فرد اِسے اپنی خواہش کے مطابق نہیں بدل سکتا جب تک کہ وہ ریاست کو پرانے نصب العین کے ترک کرنے اور اُس نئے نصب العین سے محبت کرنے پر مجبور نہ کردے جو ایک بدلے ہوئے طرزِ عمل کا متقاضی ہوتا ہے۔ قوم انسانوں کا ایک سیاسی وسماجی وثقافتی گروہ ہے جس کا وجود ہی باقی انسانیت سے اپنے الگ تشخص کے باعث قائم رہتا ہے۔ اِس کے اندر اپنی زندگی اور انفرادیت سے زیادہ سے زیادہ باخبر رہنے کے لیے جس قدر ہو سکے دیگر گروہوں سے ثقافتی اور معاشرتی لحاظ سے الگ رہنے کا میلان ہوتا ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ اِس کی اپنی زبان ہو‘ اِس کی اپنی تاریخ ہو‘ اِس کی اپنی روایات ہوں اور اِس کا اپنا امتیازی نوعیت کا طرزِ عمل اور طرزِ حیات ہو۔ یہ ہر معاملے میں دوسری قوموں پر سبقت چاہتی ہے۔ گروہ کی سرحدوں سے باہر نکلتا ہوا انسانیت کی بہبود اور آفاقیت کا جذبہ اِس کی فطرت ہی سے کوئی میل نہیں رکھتا۔ قومی گروہ کی وحدت اور سالمیت دوسرے گروہوں سے اِس کے جداگانہ تشخّص کے احساس ہی کی حامل ہے۔ نیز اِس ضرورت کے باعث ہے کہ یہ (قومی گروہ) محسوس کرتا ہے کہ اپنے آپ کا اُن (دیگر گروہوں) کے مقابلے میں دفاع کرے۔ چنانچہ جب تک یہ (گروہ) قومی گروہ ہی کی صورت میں رہتا ہے یہ کُل انسانیت کو بغل گیر کرنے کے لیے اپنی تنگ دامن ہمدردیوں کا دائرہ وسیع نہیں کرسکتا۔ جب یہ خودغرضی سے دست بردار ہوجاتا ہے تو اپنے وجود کی پہچان کھو بیٹھتا ہے۔ جب کوئی قوم ایک اصول کے طور پر سچے دِل کے ساتھ دوسری قوموں سے مبنی بر اخلاق اور مبنی بر انصاف سلوک کرنے کا فیصلہ کرلیتی ہے تو درحقیقت اُس کا نصب العین قومیت (Nationalism) سے اخلاقیت (Moralism) یا کسی دوسرے ایسے مسلک میں بدل جاتا ہے جس سے اُس کا نیا طرزِ عمل ہم آہنگ سمجھا جاتا ہے‘ گو لوگ اُسے قومیت (کا نصب العین) ہی کہتے رہتے ہیں۔ اگر ڈیوی اِس بات پر یقین رکھتا ہے‘ جیسے کہ واقعتاً اُسے یقین ہے کہ قومی طرزِ خیال جیسا کہ ہے‘ اِس قدر متعصّبانہ ہے کہ مکمل اور مناسب طور پر قابلِ تدریس نہیں تو پھر اِس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ یہ سفارش کرتا ہے کہ اِس نصب العین کو آفاقی اور ایثار پیشہ بنانے کے لیے اِس کی اصلاح کی جائے یا پھر یہ سفارش کرتا ہے کہ اِسے کسی ایسے نصب العین سے بدل دیا جائے جو آفاقی اور ایثار پیشہ ہو۔ اُس کے اپنے معیارات کے حساب سے بھی دیکھ لیں تو ایسا قومی نصب العین‘ چاہے وہ کسی بھی ملک کا ہو‘ جو جمہوریت کا حمایتی ہو‘ بہرصورت تعلیمی لحاظ سے مسترد کیے جانے کے قابل ہے۔ اِن حقائق سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ نصب العین کی قدروقیمت کی پیمائش کے لیے ڈاکٹر ڈیوی کا پیمانہ کارگر نہیں ہے۔

ڈاکٹر ڈیوی سماجی نصب العین کی قدروقیمت کا قابلِ بھروسا پیمانہ کیوں نہ مہیا کرسکا؟ اِس کی وجہ یہ امرِ واقعہ ہے کہ وہ اِس بات کا احساس کرنے میں ناکام رہا کہ علمی ذخیرہ‘ عادات‘ رویے‘ مہارتیں‘ عقائد‘ خیالات‘ نظریات‘ خواہشات وارادے‘ معیارات واقدار‘ مفادات ومقاصد‘ اُمیدیں اور آرزوئیں نیز رغبتیں اور کراہتیں‘ جیسے کہ اُس

نے خود تسلیم کیا ہے‘ کسی سماجی طبقے کے تعلیمی ورثے کی تشکیل کرتی ہیں۔ یہ تعلیمی ورثہ کے وہ عناصر ہیں جو ایک ایسے تصور سے وجود میں آتے ہیں جو انہیں اِس اَمر سے آگاہ کرنے والے پیمانے کے طور پر استعمال کرتا ہے کہ حسن و قبح کیا ہے‘ اَچھائی و برائی کیا ہے‘ سچ اور جھوٹ کیا ہے! بالفاظِ دیگر ایک سماجی نصب العین اساسی طور پر حسن‘ خیر اور صداقت کا حامل ہوتا ہے۔ متنوع سماجی نصب العینوں کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مختلف انسانی سماجی طبقات حسن‘ خیر اور صداقت کے مختلف تصورات رکھتے ہیں۔ ہر سماجی طبقہ اِن خوبیوں کو اپنے نصب العین سے منسوب کرتا ہے اس بات سے قطع نظر کہ وہ واقعی اِن خوبیوں کا حامل ہے یا نہیں! حقیقت یہ ہے کہ صرف ایک ہی نصب العین ہوسکتا ہے جس میں فی الواقع یہ خوبیاں بدرجۂ اَتم موجود ہوں۔ اگر ڈیوی اِن حقائق کا احساس کر لیتا تو وہ آسانی سے اِس نتیجے پر پہنچ جاتا کہ کسی سماجی نصب العین کے لیے صرف ایک ہی قابلِ بھروسا پیمانہ یا معیار ہوسکتا ہے اور وہ (پیمانہ یا معیار) یہ (دیکھنا) ہے کہ آیا یہ (سماجی نصب العین) حقیقتاً حسن‘ خیر اور صداقت کی تمام خوبیوں کا بدرجہ اَتم مالک ہے یا نہیں!

جیمز راس کا فلسفہ تعلیم (Educational Philosophy of James Ross)

اب ہم عہدِ حاضر کے ایک اور ممتاز ماہر تعلیم سر جیمز راس کے فلسفۂ تعلیم کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ تعلیم کا فلسفہ رکھنے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتا ہے:

’’تعلیم سے متعلق تمام سوالات بنیادی طور پر فلسفے کے سوالات ہیں۔‘‘

تاہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فلسفے کا موضوع کیا ہے؟ وہ بجا طور پر اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ فلسفہ حقیقت کی ماہیت اور انسان کی فطرت سے بحث کرتا ہے۔

’’چنانچہ فلسفیانہ تحقیق کا موضوع حقیقت بذاتہٖ سے کم کچھ نہیں۔ جب ایسا ہے (تو یہ بات ذہن میں رہے کہ) صاحبِ زبور حضرت داؤدؑ کے اُسی قدیم استفسار کی طرح فلسفے کی دنیا میں ایک بڑا سوال ہمیشہ سے یہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یعنی یہ کہ: انسان کیا ہے؟ آسمانوں اور چاند ستاروں پر غور وخوض کی حیثیت ہمیشہ سب کچھ اپنے دامن میں سمیٹ لینے والے ان سوالات کے مقابلے میں ثانوی رہی ہے کہ زندگی کی ماہیت کیا ہے‘ انسان کی فطرت کیا ہے‘ اس کا مبدا اور مقدر کیا ہے‘ اس کی جدّوجُہد کی منزل کیا ہے!‘‘

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مطابق تعلیم کے صحیح فلسفے کی بنیاد حقیقت کی ماہیت اور انسانی فطرت کے صحیح فلسفے ہی پر رکھی جاسکتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ایسا فلسفہ صرف فلسفہ تصوریت (Idealism) ہی ہوسکتا ہے جو کائنات کے خمیر میں شامل حسن‘ خیر اور صداقت کی ایسی خوبیوں کے طور پر زور دیتا ہے جن کی انسان کو تلاش وجستجو کرنا چاہیے۔ وہ اپنی کتاب ’’تعلیمی نظریے کی اساس‘‘ (Ground Work of Educational Theory) میں لکھتا ہے:

’’اس کتاب میں بالعموم یہ استدلال اختیار کیا گیا ہے کہ شعبۂ تعلیم میں سب سے زیادہ قابلِ قدر مقاصد اور تحریکیں وہ ہیں جو فطرت پسند یا افادیت پسند فلسفے سے ماخوذ نہیں بلکہ اَقدار کے تصوریت پسند فلسفے سے ماخوذ ہیں۔ صداقت‘ حسن اور خیر ایسی کامل خوبیاں ہیں جو روحانی کائنات کے خمیر میں شامل ہیں اور انسان صرف اور صرف ان خوبیوں کی تلاش وجستجو ہی سے اپنی تکمیل کر سکتا ہے۔ یہ خوبیاں انتہائی قدر وقیمت کی

حامل ہیں۔ ان (خوبیوں) کے وجود کی بقا اُن کا حق ہے جو ہم سے احترام اور اطاعت کا تقاضا کرتی ہیں۔ چنانچہ تعلیم ہر شے سے بڑھ کر یقیناً نوجوانوں کو ایسی باتوں کی راہ پر لگائے گی جو سچی‘ مخلصانہ‘ منصفانہ‘ پاک صاف‘ خوب صورت اور اچھی شہرت کی حامل ہوں۔‘‘

ہم ان کامل خوبیوں کا سراغ کیسے پا سکتے ہیں؟ اُس کے خیال میں ان کامل خوبیوں تک رسائی کا راستہ مذہب سے ہو کر گزرتا ہے۔ چنانچہ مذہب ہی کو تعلیم کی بنیاد بنانا چاہیے۔

’’عہدِ حاضر میں صاحبِ فکر لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا یقین کامل ہے کہ اگر تہذیب کی بلند سطح کو وجود میں لانا اور برقرار رکھنا ہے‘ نیز وقفے وقفے سے وقوع پذیر ہونے والی بدتہذیبی کی لغزشوں کے خلاف دفاع کرنا ہے تو تعلیم کی بنیاد لازمی طور پر مذہب پر رکھنا ہوگی۔‘‘

تاہم جب یہ بات طے کرنے کا وقت آتا ہے کہ متعلّم کو کون سا مذہب مدِّنظر رکھنا چاہیے تو وہ فلسفے کو سرے سے بھول جاتا ہے۔ یہ جاننے کے لیے کہ کن مذہبی اَقدار کو تعلیم کی بنیاد بننا چاہیے اور کیوں‘ وہ حقیقتِ وجود اور انسان کی فطرت کے حقائق سے مدد لینے کے بجائے من مانے انداز میں ایک خاص مذہب یعنی عیسائیت کے حق میں فتویٰ دے دیتا ہے۔ یوں وہ دیگر مذاہب کے ماننے والے تمام سماجی طبقوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ بلاشبہ ہر سماجی طبقہ ہر ممکن بہترین تعلیم حاصل کرنے کا یکساں طور پر آرزومند ہوتا ہے‘ تاہم راس (Ross) انہیں کوئی مشورہ نہیں دیتا جس کی اس جیسے تعلیمی فلسفی سے توقع ہوسکتی تھی۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

’’آیئے! ہم اس ابہام سے پاک ہو جائیں کہ ہم مذہب سے کیا مراد لیتے ہیں۔ ہم کچھ ایسا چاہتے ہیں جو خدا پرستی کے مبہم سے عقیدے یا کسی ضابطۂ اخلاق سے چاہے وہ کتنا ہی ارفع کیوں نہ ہو‘ کہیں زیادہ حیات آفریں ہو۔ یہودیت‘ بدھ مت‘ اسلام یا کوئی بھی دوسرا بلند مرتبت مذہب جو برطانوی دولتِ مشترکہ کے ہمارے جیسے بہت سے بھائی بندوں کی زندگی میں ہدایت اور تحریک فراہم کرتا ہے‘ کی عزّت وتوقیر میں کمی کیے بغیر ہم لازمی طور پر اس بات پر زور دیں گے کہ مذہب سے مراد مسیحی مذہب ہے۔ خود مادرِ وطن کے شہریوں کی بڑی اکثریت کی بھی یہی رائے ہے۔ چنانچہ مسیحی مذہب کو یقینی طور پر قوم کی وسیع تر حیات کے ساتھ ساتھ اسکولوں کے روایتی مقام کی جانب پلٹنا چاہیے۔‘‘

اس کے بعد وہ فروری ۱۹۴۰ء میں شائع شدہ ’’دی ٹائمز‘‘ لندن کے ایک اداریے کا حوالہ دیتا ہے جس میں اداریہ نگار شکوہ کرتا ہے کہ ’’ایک ایسا ملک جو مبینہ طور پر مسیحی ہے اور ایک ایسا ملک جو اس وقت مسیحی اصولوں کے دفاع میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رہا ہے‘ وہاں قومی تعلیم کا ایسا نظام ہے جو مستقبل کے شہریوں کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ خالصتاً غیر مذہبی تعلیمی پرورش پائیں۔‘‘ وہ اس نقطۂ نظر کا اظہار کرتا ہے کہ ’’صرف مذہب جس تعلیم کی بنیاد ہوگا وہی تعلیم‘ تعلیم کا نام پانے کی مستحق ہے‘‘ اور ’’مذہب کے بغیر تعلیم حقیقتاً ہرگز تعلیم نہیں ہے۔‘‘ وہ کہتا ہے کہ ’’اچھی شہریت کی بنیاد کردار پر ہے اور ایک انسان کے لیے کردار کا انحصار اس کے معتقدات پر ہوتا ہے۔‘‘ وہ پوچھتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی ریاست ’’ان سادہ سی صداقتوں کو نظر انداز کرنے کی ہمت رکھتی ہو اور مذہبی تعلیم کو ایک

ایسا دشوار کام سمجھے کہ جس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ ہو‘‘۔ ’’دی ٹائمز‘‘ کا اداریہ نگار کہتا ہے:

’’کئی سالوں سے ہم روحانی راس المال پر گزارہ کر رہے ہیں یعنی مستقبل کو کچھ دینے کی بجائے ماضی سے وراثت میں ملی روایات کے سہارے جی رہے ہیں۔ مسیحیت کو ہوا سے دل میں نہیں اتارا جا سکتا۔ یہ فلسفہ نہیں بلکہ ایک تاریخی مذہب ہے۔ اگر اس کے اُن حقائق کی جن پر اس کی بنیاد ہے‘ تعلیم نہیں دی جاتی اور اس نوع کی تدریس کو ہمارے تعلیمی نظام کا مرکز نہیں بنایا جاتا تو یہ یقینی طور پر زوال پذیر ہو جائے گا۔ نوجوانوں کی تعلیم وتربیت میں نہایت بلند مرتبہ علم کو نہایت بلند مقام ومرتبہ دیا جانا ضروری ہے۔‘‘

آخر میں سر راس پرزور سفارش کرتا ہے کہ:

’’مذہب کی حیثیت یقینی طور پر درسی نظام الاوقات پر ایک مضمون سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اگرچہ اس کے خصوصی مطالعے کے لیے وقت کا تو لازماً تعین کیا جائے گا تاہم اسے ایک ایسی سرگرمی اور جذبہ ہونا چاہیے جو (مدرسے کی ساری) زندگی اور مشاغل پر حاوی ہو۔ ہمیں طلبہ کو مسیحی اخلاق وعقائد کی محض تلقین کرنے سے کچھ بڑھ کر سعی کرنا ہوگی۔ ہمیں یقیناً اپنی تہذیب کی مسیحی بنیادوں کا محض معروضی مطالعہ فراہم نہیں کرنا بلکہ (طلبہ کو صحیح معنوں میں) عیسائی بنانے کے لیے کوئی سوچا سمجھا قدم اٹھانا ہے۔ ہم بحیثیت مجموعی لازماً اس امر کی کوشش کریں گے کہ طلبہ کے لیے ایسا سازگار ماحول تخلیق کیا جائے کہ وہ ازخود مسیح کے لیے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے والے نیز اپنے عقیدے کو کسی اصول وضابطے کے تحت پیش کرنے والے اور صدقِ دل سے اس پر ایمان لانے والے بن جائیں۔ ڈاکٹر جے ڈبلیو سکنر نے جان ویزلے کے الفاظ میں یہ بات کہی ہے کہ ہمارے اسکولوں کو لازماً (مسیحیوں کی) تربیت گاہیں ہونا چاہیے۔ ہم یقیناً اپنے طلبہ کے اذہان میں وہ بیج بوئیں گے جس سے خدا کے احکام بجا لانے والے اور چاہنے والے نیز بندوں کی مدد کرنے والے اور ان سے محبت کرنے والے پیدا ہوں۔ ہم ہر صورت اپنی کوششیں جاری رکھیں گے چاہے ہم ان (کوششوں) کے فوری نتائج دیکھ سکیں یا نہ دیکھ سکیں۔‘‘

تعلیمی مسئلے کے حوالے سے اس زاویہ نظر کو علمی یا سائنسی نہیں کہا جا سکتا۔ اگرچہ ان وجوہ کی بنا پر جن کی تفصیل اس کتاب کے آئندہ ابواب میں بیان ہوگی‘ راس کی اس بات سے اتفاق کرنا ناگزیر ہے کہ بشمول مسیحیت تمام عظیم مذاہب میں کچھ ایسی یکساں بنیادی مذہبی اقدار ہیں جنہیں لازمی طور پر نظامِ تعلیم کی اساس بننا چاہیے۔ تاہم اس کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ برطانیہ کے شہریوں کی بڑی اکثریت کے لیے بحیثیت مجموعی تعلیم کی بنیاد مسیحیت کو بنانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس مذہب پر یقین رکھتے ہیں۔ اگر بحیثیت تعلیمی فلاسفر اس کا حاصلِ فکر یہی تھا کہ کسی سماجی طبقے کے لیے تمام مذاہب میں سے صرف مسیحیت ہی سب سے زیادہ تعلیمی استعداد کی حامل ہے تو اس نتیجے پر پہنچنا اس کا حق تھا‘ تاہم بحیثیت تعلیمی فلاسفر اپنے اس حاصلِ فکر کے حوالے سے دیگر ماہرینِ تعلیم کے استفادے کے لیے اسے کوئی دلیل یا علمی توجیہ بھی دینی چاہیے تھی۔ بدقسمتی سے اس کا رویہ ایک تعلیمی فلاسفر کی نسبت ایک پادری سے زیادہ مشابہ ہے‘ کیوں کہ ایک تعلیمی فلاسفر تعلیم کے موضوع پر صرف علمی ومنطقی نقطۂ نظر سے بات کرتا ہے۔

(جاری ہے)

مبادیٔ علمِ کلام (۴)

سعید عبداللطیف فودہ

ترجمہ: مکرم محمود

پچھلی قسط میں امام ابوالحسن الاشعریؒ کا ابتدائی مختصر تعارف ہو چکا ہے۔ اس قسط میں ان کا کچھ مزید تعارف‘ ان کے فضائل و مناقب‘ ان کے کارہائے نمایاں‘ اعتزال سے اہلِ سُنّت کی طرف رجوع کے قصے کا تفصیلی بیان ہے۔ ان کے حوالے سے کچھ مائل بہ تجسیم گروہوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا گیا ہے۔ ذیل میں علامہ ابن تیمیہؒ کے حوالے سے مصنف نے کافی سخت موقف اپنایا ہے۔ یہ بہر حال مصنف کا اپنا اجتہاد ہے۔ چونکہ ترجمہ ترتیب سے چل رہا ہے اس لیے اس سارے حصہ کا ترجمہ بھی بعینہٖ دے دیا گیا ہے۔ عنوانات راقم الحروف کے لگائے ہوئے ہیں۔

امام اشعریؒ کا اعتزال سے رجوع کیسے ہوا؟

ایک اہم بات کا جاننا عاقل کے لیے ضروری ہے کہ: جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ جب امام اشعری کو ایک زمانہ معتزلہ کے عقائد پر گزر گیا‘ یہاں تک کہ آپ کا شمار ائمۂ مذہب میں ہونے لگا اور آپ مخالفین کو مناظرے اور دلائل سے خاموش کیا کرتے تھے‘ پھر آپ نے مذہب اہلِ سُنّت والجماعت کی طرف رجوع کیا۔ ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف تحوّل کا یہ واقعہ ہمارے لیے یقیناً کچھ بصیرتوں کا حامل ضرور ہوگا۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ تبدیلی ہو کیسے گئی؟ اس تحوّل کا صحیح ادراک جو امام کی سیرت سے منقول واقعات اور معقول سے بھی موافقت رکھتا ہو‘ ایک عاقل کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ہم اللہ کی مدد سے اس اہم بات کی وضاحت کی کوشش کرتے ہیں۔

امام اشعری نے مذہب اعتزال پر غور و خوض کیا اور معروف طریقے پر اس مذہب کے مسائل کا احاطہ کیا اور ان کی حد بندی کی۔ یہ ایک ایسے انسان کی جس کی نیت اللہ کے لیے خالص ہے‘ صفات میں داخل ہے کہ وہ عقائد کے معاملات میں اپنا کل دار و مدار تقلید پر نہیں رکھتا‘ چاہے جس کی وہ تقلید کرتا ہو وہ علماء کا امام ہی کیوں نہ ہو‘ اس کے بجائے وہ اپنے فکر کو کام میں لاتا ہے اور جن افکار کو اس نے اپنایا ہوتا ہے اور جن کا وہ دفاع کرتا ہے ان پر بھی وہ غور و خوض کرتا رہتا ہے۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے کہ انسان کسی بات کو حق سمجھے‘ پھر جب دلیل سے اسے اس بات کا غلط ہونا معلوم ہو جائے تو جو بات اس پر اب واضح ہوئی ہے وہ اس کی طرف رجوع کرے۔ ایسا طرزِ عمل اس کی

روح کے بے عیب ہونے‘ اخلاص اور بلند ہمتی کی دلیل ہے۔ اس لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ جب امام اشعری نے معتزلہ کے ہر مسئلہ پر الگ سے غور کیا تو ان میں سے بہت کا غلط ہونا ان پر واضح ہوگیا۔ انہوں نے اپنے معتزلی مشائخ سے باری باری مناظرہ کیا تاکہ ان پر حق واضح ہو جائے۔ وہ جان بوجھ کر ان پر اعتراضات وارد کرتے تھے اور پھر ان اعتراضات کی توجیہہ کی کاوش بھی کرتے۔ جب مسائل بہت زیادہ ہو گئے تو ان پر اپنی غلطی واضح ہو گئی۔

متکلمین اہلِ سُنّت والجماعت کا کامل منہج

ان کے نزدیک یہ ضروری ہوگیا کہ جن اصولوں پر مذہب اعتزال کی بنیاد قائم ہے‘ ان پر ازسرِنو غور کیا جائے۔ اس کے نتیجے میں ان کو ایسے فکری نتائج حاصل ہوئے جنہوں نے امام اشعری کے ایک عبوری دور کو ممکن بنایا‘ جس سے گزر کر وہ اس کامل منہج عقلی تک پہنچ سکتے تھے۔ ایک ایسا منہج جس کی بنیاد پر قرآن وسُنّت سے درست معانی بھی اخذ کیے جا سکیں اور ایسا فہم بھی حاصل ہو جائے جو مکمل طور پر اپنی بنیادیں شریعت میں وارد ہونے والی نصوص واخبار پر رکھتا ہو۔ یہ فہم کسی ایسے معاملے سے ٹکراتا نہ ہو جس کی تائید عقل کرتی ہو۔ وہ منہج اور فہم نصوص کے مابین اختلاف کا باعث نہ بنے تاکہ ان میں سے کسی کو چھوڑنا نہ پڑے۔ وہ داخلی ہم آہنگی رکھتا ہو اور اقوالِ سلف کی توضیح اور تفسیر کرتا ہو‘ وہ سلف حق کہ جن کے بارے میں صاحبِ شریعت نے صلاح اور تقویٰ کی شہادت دی ہے۔

پھر اس منہج اور اس کے اصولوں کو انہوں نے اپنی کتابوں میں بیان کیا۔ لوگوں کو ان کی طرف دعوت دی اور انہی قواعد کی بنیاد پر اپنے مخالفین سے مناظرے کیے۔ جب یہ اصول وقواعد مشہور ہوئے اور علمائے شریعت نے ان پر غور کیا تو انہوں نے قرآن وسُنّت‘ اپنے فہم‘ جو اقوالِ سلف ان تک پہنچے تھے اور ان اصول وقواعد میں مطابقت محسوس کی۔ اس غور وفکر اور اجتہاد کے بعد ان کا گویا اتفاق ہوگیا کہ امام ابوالحسن الاشعری اہلِ سُنّت والجماعت کے نمائندے ہیں‘ انہوں نے ان ہی کے طریقہ کو ظاہر کیا ہے اور اس کی بنیاد پر مخالفین کا ردّ کیا ہے۔ امام صاحب کا یہی امتیاز ہے کہ انہوں نے سلف صالح کے عقائد کا دفاع کیا‘ اہلِ سُنّت کے طریقے کی تحقیق کی اور اس کو دلائل سے مضبوط کیا۔ مخالفین کے مذہب میں جو مسائل تھے ان کو بیان کیا۔ ان کے طریقے میں جو نقص‘ اجمال اور ابہام رہ گیا تو اس کو بعد میں آنے والے علمائے اہلِ سُنّت نے دور کر دیا اور ان کی شرح ووضاحت کی۔ یہ کام علماء نے شریعت کے تحفظ کے لیے کیا۔ ہم امام اشعری کو معصوم نہیں سمجھتے بلکہ محض ان کی قدر ومنزلت‘ عمل کی عظمت‘ اللہ کی دی گئی توفیق اور ان کی جو تعریف ومدح علمائے اہلِ سُنّت نے کی ہے‘ اس کو بیان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

امام اشعری کا اعتزال سے مذہب اہلِ سُنّت تک تدریجی سفر

اس مختصر کلام سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ امام اشعری مذہب اعتزال سے مذہب اہلِ سُنّت کی طرف اچانک نہیں آ گئے تھے‘ جیسا کہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں۔ ان کی زندگی کے واقعات اور عام طور پر انسانوں کے احوال سے مناسبت ومطابقت یہی بات واضح کرتی ہے کہ یہ تدریجی طور پر کامل ہونے کے قصہ کا بیان ہے۔ اس تدریج سے ہر وہ انسان لازماً گزرتا ہے جو حق تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے‘ غور وفکر کرتا ہے اور جسے مخالفین کے ساتھ

مناظرے در پیش ہوتے ہیں۔ امام صاحب کا یہ تحوّل اس وجہ سے کوئی خیانت نہیں ہے کہ انہوں نے تعلیم تو معتزلہ سے حاصل کی تھی۔ خیانت تو یہ ہوتی کہ وہ حق کے واضح ہو جانے کے بعد بھی انہیں کے ساتھ چلتے رہتے۔ نہ ہی امام صاحب کی یہ تبدیلی کوئی خواب دیکھنے کا نتیجہ تھی۔ ہاں' آپ نے خواب میں نبی محترم ﷺ کو دیکھا تھا اور آپ کا یہ دیکھنا گویا ایک بشارت تھی۔ یقیناً ہم اس طرح کے عمدہ خواب کے منکر نہیں اور نہ ہی اس کی اہمیت سے غافل ہیں۔ البتہ وہ معقول اور مقبول توجیہہ جو عام طور پر بشری عادات کا بھی احاطہ کرتی ہے اور جس کو اختیار نہ کرنے کی بھی کوئی وجہ ہمارے پاس نہیں' وہ یہی ہے کہ یہ خواب امام صاحب نے اپنی کاوشوں کو راہِ حق میں اخلاصِ نیت کے ساتھ کھپانے کے بعد دیکھا۔ چنانچہ خواب میں اللہ کے نبی ﷺ کو دیکھنا آپ کی ان کوششوں کا گویا ایک صلہ تھا اور اس طریقہ پر چلنے کے لیے ان کے عزم مصمّم کو ایک غیبی امداد فراہم کی گئی تھی۔

کیا امام اشعریؒ نے کوئی نیا مذہب ایجاد کیا؟

امام صاحب نے کوئی نیا مذہب ایجاد نہیں کیا بلکہ ان کا کل عمل اہلِ سُنّت کے اقوال کی شرح اور ان کو دلائل سے مدد فراہم کرنا ہے۔ قاضی عیاض امام صاحب کے حالات زندگی کے بیان میں کہتے ہیں:

''آپ نے اہلِ سُنّت کے لیے بہت سی تصانیف لکھیں۔ آپ نے اثباتِ سُنّت کے ساتھ صفاتِ باری تعالیٰ میں قدم' کلام' قدرت اور رؤیتِ باری تعالیٰ کے حوالے سے اہلِ بدعت کے انکار کے ردّ پر دلائل قائم کیے۔ معتزلہ نے سمعیات سے متعلق جن امور کا انکار کیا' مثلاً پُل صراط' میزان' شفاعت' حوضِ کوثر' عذابِ قبر' ان سب پر بھی دلائل قائم کیے۔ یہ تمام واضح دلائل قرآن و سُنّت سے بھی ماخوذ تھے اور عقل سے بھی۔ اہلِ بدعت' ملحدین اور روافض کے شبہات کو دور کیا۔ ان مباحث کے حوالے سے مبسوط تصانیف فرمائیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اُمّت کو نفع پہنچایا۔ آپ نے معتزلہ سے مناظرے بھی کیے' جو آپ قصداً کیا کرتے تھے۔ اس حوالے سے آپ سے پوچھا گیا: آپ اہلِ بدعت سے کیوں ملتے ہیں' حالانکہ خود ان سے دور رہنے کا کہتے ہیں؟ پھر اہلِ بدعت اس وقت غالب بھی ہیں اور ان کی باتیں شائع و ذائع بھی؟ آپ نے فرمایا: وہ طاقت والے لوگ ہیں۔ کوئی بادشاہ ہے' کوئی قاضی ہے' وہ اپنے اس مرتبہ کی وجہ سے ہم تک تو نہ آئیں گے۔ اگر ہم ان تک نہ جائیں تو حق کیسے ظاہر ہوگا اور یہ کیسے جانا جائے گا کہ اہلِ حق میں دلائل سے حق کی نصرت کرنے والے بھی موجود ہیں۔ (ظاہر ہے کہ یہ بات اس علم کے متخصّصین کے لیے ہے نہ کہ ہر کس و ناکس کے لیے)۔

آپ کے اکثر مناظرے جبائی معتزلی کے ساتھ ہیں۔ اس سے آمنا سامنا بہت سی مجالس میں ہوا۔ امیر بصرہ ابن وفاء کی مشہور مجلس مناظرہ میں امامت کے مسئلے پر بھی ایک مناظرہ ہوا' جو آپ کے علمی مقام اور فنی دسترس کے اظہار کا باعث بنا۔

ایک زمانہ آیا کہ آپ کی تصانیف کثیر ہو گئیں۔ آپ کی بات سے فائدہ اٹھایا جانے لگا' اہلِ حدیث و اہلِ فقہ پر دین و سُنّت کی حفاظت کے لیے کی جانے والی آپ کی کوششیں آشکار ہو گئیں تو اہلِ سُنّت نے آپ کی کتب سے اخذ و استفادہ کیا۔ امام صاحب کے طریقہ کو سیکھا۔ ایک کثیر تعداد آپ کے متبعین اور طلبہ کی ایسی ہو گئی کہ جنہوں نے دین و سُنّت کی حفاظت کے ان مناہج کی تعلیم حاصل کی اور ملّتِ اسلامیہ کی نصرت

کے لیے دلائل سیکھے تو وہ آپ کے نام سے پہچانے جانے لگے۔ پھر آگے ان کے شاگردوں اور متبعین کی تعریف بھی اسی نام سے ہونے لگی۔ اس سے پہلے یہ لوگ ''مثبتۃ'' کے نام سے جانے جاتے تھے۔ اس نام کی اصل وجہ معتزلہ تھے کہ مثبتہ نے سُنّت وشریعت میں ان باتوں کو ثابت کیا جن کی نفی معتزلہ نے کی تھی۔ سُنّت کی حفاظت کرنے والے ائمہ پہلے اسی نام سے جانے جاتے تھے۔ مثلاً اصحاب حدیث میں سے محاسبی' ابن کلاب' عبدالعزیز بن عبدالملک المکی' کرابیسی وغیرہ۔ یہاں تک کہ امام ابوالحسن الاشعری آ گئے اور ان کی شہرت ہوئی تو طلبہ اور ان کے فہم سے اخذ کرنے والوں نے اپنی نسبت ان کی طرف کی۔ امام شافعی' امام مالک' امام ابوحنیفہ اور دوسرے ائمہ (رحمہم اللہ) کے ماننے والے جو ان کی کتابوں کو پڑھتے ہیں' شریعت میں ان کے فہم اور طریقہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں' اس کی پیروی کرتے ہیں' اپنی طرف سے کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتے اور ان کی طرف اپنی نسبت کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح کا معاملہ امام اشعری کا ہے۔ مشرق و مغرب سے لوگ ان کے دلائل سے استفادہ کرتے ہیں اور ان کے طریقہ پر چلتے ہیں۔ بے شمار لوگ ان کے مذہب اور طریقہ کی تعریف کرتے ہیں۔

امام اشعری کے مخالفین

امام ابوحنیفہ کی پیروی کرنے والا ایک گروہ جو اصول میں اعتزال پر تھا' مثلاً عبدالجبار قاضی الرّی' تنوخی اور اس کے علاوہ غالی ائمہ معتزلہ امام اشعری کے خلاف تھے۔ دوسری طرف وہ قوم بھی امام اشعری کے خلاف تھی جو اپنا انتساب تو امام احمد بن حنبلؒ کی طرف رکھتی تھی لیکن انہوں نے تاویل کو مکمل طور پر چھوڑنے میں اتنا غلو کیا کہ تشبیہ کے قائل ہو گئے۔ ان میں سے اکثر اصحابِ علم نہ تھے مگر چونکہ ان کا انتساب سُنّت اور حدیث کی طرف کیا جاتا تھا اس لیے عوام ان کے اقوال قبول کر لیتے تھے' معتزلہ کی طرح ان سے تنفّر نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے عوام کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ امام اشعری بدعتی تھے اور ان کی طرف ایسے اقوال منسوب کیے کہ (جو انہوں نے کبھی کہے ہی نہ تھے بلکہ) انہوں نے اپنی زندگی ایسے اقوال کے کہنے والوں کو جھٹلانے اور گمراہ کہنے میں گزار دی۔

ابن حزم الاندلسی الظاہری نے اپنی کتاب ''النصائح والفضائح'' میں آپ پر اور دوسرے ائمہ اشاعرہ پر جھوٹ اور بے بنیاد طعن وتشنیع کی بھرمار کر دی۔ البتہ اپنی کتاب ''الفصال'' (اصل میں یہ ''الفصل فی الملل والأهواء النحل'' ہے) میں آپ کی تعریف بھی کی اور اہلِ حدیث کا متکلم کہا جن کے اقوال پر شافعی اور مالکی ائمہ راضی ہیں۔ بہت سے اہلِ حدیث نہ صرف آپ سے راضی ہیں بلکہ آپ کے اقتباسات بھی نقل کرتے ہیں۔ بعض نے تو امام اشعری اور آپ کے اصحاب سے درس لیا۔ یہاں تک کہ اس طریقہ میں خود امام سمجھے جانے لگے اور امام اشعری کے طریقے پر متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں۔''

پھر (قاضی عیاض) کہتے ہیں:

''جو آپ کی تالیفات پر نظر ڈالے گا وہ یہ جان لے گا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی توفیق خاص سے امداد فرمائی ہے۔ ان کے بارے میں ایک حدیث بھی نقل کی جاتی ہے۔ نہ میں اس کی اصل سے واقف ہوں اور نہ روایت کرتا ہوں اس لیے تذکرہ نہ کروں گا۔'' (اس حدیث کا آگے تذکرہ ہوگا) (ترتیب المدارک: ۲۴/۵)

قاضی عیاض کا کلام ختم ہوا جو کہ معتبر ائمہ مالکیہ میں سے ہیں۔ یہ کلام مختصر ہونے کے باوجود بہت سے قیمتی نکات کا حامل ہے' جو غور کرے اور حاضر ہو تو یقیناً پا جائے۔ امام تاج الدین السبکی فرماتے ہیں:

''جان لو کہ امام ابوالحسن الاشعری نے کوئی نئی رائے ایجاد نہیں کی اور نہ ہی کسی نئے مذہب کی بنا ڈالی۔ وہ تو مذہبِ سلف ہی کو بیان کرنے اور اصحابِ رسولؐ ہی کے طریقہ پر جدّوجُہد کرنے والے تھے۔ مذہب کا انتساب آپ کی طرف اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ طریق سلف کو واضح کرنے والے اور اس کی حدود کا تعیّن کرنے والے آپ ہی تھے۔ آپ طریق سلف سے نہ صرف چمٹے رہے بلکہ اس پر دلائل بھی قائم کیے۔ دلائل میں آپ کی پیروی کرنے والا اشعری کہلایا۔ میں اپنے والد صاحب (امام تقی الدین السبکی) سے کئی دفعہ یہ عرض کر چکا ہوں کہ مجھے حافظ ابن عساکر پر تعجب ہے کہ انہوں نے جب بھی امام اشعری کے متبعین کے گروہ کا اندازہ لگایا ہے تو کم ہی لوگوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اگر وہ اس کام کا حق ادا کرتے تو چاروں مذاہب کے اکثر علماء کو لازماً شامل کرتے کہ وہ عقائد میں ان ہی کے رستے کے پیرو تھے۔ والد صاحب نے جواب دیا کہ ابن عساکر نے صرف ان لوگوں کو شمار کیا ہے جنہوں نے اس طریقہ میں کوئی کوشش ومحنت کی ہے (اس وجہ سے ان کا عقائد میں اشعری ہونا سامنے آیا)' ورنہ اصل بات تو وہی ہے جو تم نے کہی کہ تمام مذاہب کے اکثر علماء آپ کے ساتھ ہیں۔

شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام نے ایک جگہ ذکر کیا کہ امام اشعری کے عقیدہ پر شافعی' مالکی' حنفی اور بہت سے حنابلہ متفق ہیں۔ آپ کی اس بات میں اس زمانے کے ایک بڑے مالکی شیخ ابوعمرو بن الحاجب اور حنفیہ کے ایک شیخ جمال الدین الحصیری نے موافقت کی۔'' (طبقات الشافعیہ الکبریٰ: ۳/۳۶۵)

ایک اور موقع پر تاج الدین السبکی فرماتے ہیں:

''المایرقی کہتے ہیں کہ اہلِ سُنّت کے ترجمان کے طور پر امام اشعری پہلے متکلم نہ تھے بلکہ وہ تو اپنے سے پہلوں کے طریقہ پر ہی چلے ہیں اور جن آراء کی انہوں نے دلائل سے تائید کی وہ بھی معروف ہیں۔ بس ہوا یہ کہ دلائل کے اعتبار سے اور وضاحت میں وہ آراء اور وہ طریقہ (آپ کی اس کاوش کی وجہ سے) زیادہ نمایاں ہو گئے۔ آپ نے نہ کوئی نئی بات نکالی اور نہ ہی کوئی نیا مذہب ایجاد کیا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اہلِ مدینہ کا مذہب امام مالک کی طرف منسوب ہے اور جو اہلِ مدینہ کے طریقہ پر ہوتا ہے اسے مالکی کہا جاتا ہے' حالانکہ امام مالک بھی تو اپنے سے پہلوں کی راہ پر ہی چلے ہیں بلکہ آپ تو بہت ہی زیادہ اپنے بڑوں کی پیروی کرنے والے تھے۔ (امام مالک کی کاوشوں سے) یہی ہوا کہ توضیح وبیان میں اضافہ ہو گیا تو اس طریقہ کو آپ کی طرف منسوب کیا جانے لگا۔ یہی معاملہ امام اشعری کا ہے۔ سلف کے مذہب کی شرح وتوضیح اور دلائل سے اس کی نصرت میں آپ سے آگے کوئی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ القابسی کہتے ہیں کہ ابوالحسن حق کی نصرت کرنے والوں میں سے ہی ایک تھے۔ اہل عدل وانصاف سے کوئی آپ کو اس رتبہ سے معزول کرنے کا نہیں سوچ سکتا اور نہ آپ کے عہد میں کسی دوسرے کو آپ سے بلند رتبہ سمجھ سکتا ہے۔ آپ کے بعد اہلِ حق آپ کی راہ پر ہی چلے ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ امام اشعری ایک دن وفات پا گئے اور اہلِ سُنّت تھے کہ آپ پر روتے تھے اور اہلِ بدعت خوشیاں مناتے تھے۔'' (طبقات الشافعیہ الکبریٰ: ۳/۳۶۷)

امام سبکی امام بیہقی کا طویل کلام نقل کرتے ہیں۔ امام بیہقی کو جاننے والے جانتے ہیں (کہ وہ کس رتبہ اور مقام کے آدمی تھے) ہم ان کا کچھ کلام یہاں نقل کرتے ہیں:

''شیخ ابوالحسن الاشعری کے فضائل و مناقب اس قدر زیادہ ہیں کہ اس مختصر رسالہ میں ان سب کا ذکر ممکن نہیں۔ طوالت میں بوریت کا ڈر بھی ہوتا ہے۔ میں اللہ کے حکم سے ان کے شرف کا جو ان کے آباء و اجداد کی نسبت سے ہے، ذکر کروں گا۔ آپ کے علم اور حسنِ اعتقاد کے اعتبار سے فضل اور اس بڑے مقام و مرتبہ کا بھی ذکر کروں گا جو آپ کے اصحاب کی کثرت سے ظاہر ہے۔ وہ اصحاب جو آپ کا اور آپ کے اَتباع کا دفاع کرتے ہیں۔'' (طبقات الشافعیہ الکبریٰ: ۳/۳۹۷)

آپ کے تعارفی احوال اور نسب کا تذکرہ کرنے کے بعد امام بیہقی فرماتے ہیں:

''یہاں تک کہ نوبت ہمارے شیخ امام اشعری تک آ گئی۔ انہوں نے دین میں کوئی نئی بات ایجاد نہیں کی اور نہ ہی بدعت کو لے کر آئے بلکہ صحابہ و تابعین اور ان کے بعد آنے والے اصولِ دین کے ائمہ کے اقوال ہی کو لیا اور شرح و وضاحت سے ان اقوال کی نصرت کی۔ بے شک آپ جو فرماتے ہیں اور اصولِ دین میں جو آپ کا منہج ہے وہ نہایت معقول ہے، اہل اہواء چاہے جو بھی سمجھتے رہیں۔ ان اہل اہواء کا کہنا ہے کہ آپ کی بعض آراء سیدھی راہ سے ہٹی ہوئی ہیں اور یہ کہ آپ اپنے بیان و دلائل میں اہلِ سُنّت کی نمائندگی نہیں کرتے۔

آپ نے اپنے سے پہلے آنے والے بہت سے ائمہ کے اقوال کی نصرت فرمائی۔ مثلاً امام ابوحنیفہ اور سفیان الثوری اہلِ کوفہ میں سے، امام اوزاعی اور کچھ دوسرے ائمہ اہلِ شام میں سے، امام مالک اور شافعی اہلِ حرمین میں سے۔ اسی طرح اہلِ حجاز میں سے اور دوسرے بلاد کے ائمہ کی۔ امام احمد بن حنبل اہلِ حدیث میں سے، اللیث بن سعد اور اہلِ آثار میں سے امام بخاری اور امام مسلم وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم۔''

یہاں تک کہ امام بیہقی کہتے ہیں کہ آپ کا شمار کسی خاص زمانے کے نہیں بلکہ تمام زمانوں کے اہلِ سُنّت کے چوٹی کے علماء میں ہونے لگا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک پیشین گوئی فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی میں ایسے لوگ مبعوث فرمائیں گے جو اُس کے دین کی تجدید کریں گے۔ پھر امام بیہقی وہ حدیث اشعریین لے کر آتے ہیں جس کی طرف اشارہ قاضی عیاض نے بھی کیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''سب سے زیادہ ذہانت والے لوگ سامنے آئیں'' تو اشعری قبیلے کے لوگ آگے آئے، جن میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ''ایمان یمنی ہے اور حکمت بھی یمنی ہے۔ تمہارے پاس اہلِ یمن میں سے لوگ آئیں گے جو دماغ میں سب سے زیادہ تیز اور دل کے سب سے زیادہ نرم ہوں گے۔'' ایک حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿فَسَوۡفَ يَاۡتِى اللّٰهُ بِقَوۡمٍ يُّحِبُّهُمۡ وَيُحِبُّوۡنَهٗ﴾ (المائدۃ: ۵۴)

''عنقریب اللہ ایسی قوم کو لائے گا کہ جن سے اللہ محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔''

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی کمر تھپتھپاتے ہوئے کہا کہ وہ اس کی قوم میں سے ہوں گے۔'' پھر امام بیہقی فرماتے ہیں:

''جب اہلِ بدعت کی کثرت ہوگئی اور انہوں نے کتاب وسُنّت کے ظاہر کو چھوڑ دیا' اللہ تعالیٰ کی جو صفات نصوص میں وارد ہوئی ہیں (مثلاً حیاۃ' قدرت' علم' ارادہ' سمع' بصر' کلام' مشیئت' بقا) ان کا انکار کیا' معراج' عذابِ قبر' میزان' اہلِ ایمان دوزخ سے نکالے جائیں گے' اللہ کے نبی ﷺ کے لیے حوضِ کوثر اور شفاعت' اہلِ جنت کے لیے دیدارِ خداوندی' خلفائے اربعہ کا برحق ہونا ان سب باتوں کے واضح معانی میں جھگڑنے لگے (تاویلات کیں' عجیب وغریب مطلب نکالے) اور اس باطل زعم میں مبتلا ہو گئے کہ ان میں کوئی بات درست نہیں ہے اور نہ ہی عقل ورائے کی میزان پر پوری اترتی ہے' تو پھر اللہ تعالیٰ نے ابوموسیٰ اشعری ؓ کی نسل سے ایک امام کو پیدا کیا۔ اس نے دین کی مدد کی اور زبان و بیان سے خدا کے دین سے روکنے والوں کے خلاف جہاد کیا۔ اس بات کو اہلِ یقین کے لیے مزید واضح کر دیا کہ کتاب وسُنّت جو علم لے کر آئے اور جس راہ پر ہمارے سلف تھے' سیدھی عقلوں کے لیے وہی درست راہ ہے۔''

(طبقات الشافعیہ الکبریٰ: ۳/۳۹۸)

امام بیہقی کی اس کتاب کے بارے میں جس سے ہم نے ایک مختصر اقتباس ابھی نقل کیا ہے' امام سبکی کہتے ہیں:

''اس کتاب اور اس کے مصنف جس کے دین' تقویٰ' حافظہ' باخبری' علم' ثقاہت' امامت اور ثبات سے تم واقف ہو' کی بات کا اگر خلاصہ بیان کیا جائے تو یہ ہے کہ صحابہ کرام ؓ اور ان کی بہترین طریقہ پر پیروی کرنے والے علماء' فقہاء اور محدّثین اُمّت' امام اشعری کے عقیدہ پر تھے' بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ امام اشعری ان کے عقیدہ پر تھے۔ آپ کمر ہمت کس کر کھڑے ہوئے اور اس عقیدہ کے دفاع کے لیے جِدّوجُہد کی۔ اس علمی ذخیرہ کی حفاظت کی کہ اس تک اہل باطل کی رسائی غلط نیت سے نہ ہو سکے اور غلو کرنے والوں کی تحریفات سے محفوظ رہے۔'' (الطبقات الکبریٰ: ۳/۳۹۹)

شیخ علیش اپنے فتاویٰ میں ایک سوال کہ کیا امام اشعری علم توحید کے وضع کرنے والے تھے' کے جواب میں فرماتے ہیں:

''اصل میں تو اللہ تعالیٰ ہی اس کا وضع کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بہت سی آیات عقائد اور ان کے دلائل و براہین کے بیان کے لیے نازل فرمائیں۔ اس علم پر کچھ مرتّب کلام امام اشعری سے پہلے ہمیں امام مالک کے ہاں بھی مل جاتا ہے۔ علامہ الیوسی اپنی کتاب ''قانون'' میں فرماتے ہیں: ''اس علم کلام کے وضع کرنے کے حوالے سے امام اشعری کا نام لیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے ہی اس علم کی باقاعدہ تدوین کی' اس کے مطالب کو مرتب کیا اور اس کی بنیادوں کو واضح کیا۔ آپ امام اہلِ سُنّت ہیں' اس میں کوئی شک نہیں لیکن ان کو اس علم کا وضع کرنے والا کہنے میں کچھ اشکال ہے۔ یہ علم آپ سے پہلے بھی تھا اور کچھ علماء اس میں غور وخوض کیا کرتے تھے' مثلاً قلانسی اور عبداللہ بن کُلّاب۔ یہ لوگ شیخ اشعری کی آمد سے قبل ''مثبتہ'' کے عنوان سے جانے جاتے تھے' کیونکہ معتزلہ جن باتوں کی نفی کیا کرتے تھے یہ ان کو ثابت کرتے تھے۔ پھر ایک اہم بات یہ ہے کہ علم کلام کے عنوان کا انطباق اہلِ سُنّت کے موافقین اور مخالفین سب کے علم پر ہوتا تھا۔ شیخ نے اس علم کی تحصیل ابوعلی جبائی سے کی تھی جس کا قصہ ہمیں معلوم ہے۔ تو پھر اس علم کے وضع کرنے والے شیخ ابوالحسن الاشعری کیسے ہو سکتے ہیں؟

بہتر یہی ہے کہ اسے قرآنی علم قرار دیا جائے کیونکہ اس کے بنیادی مسائل کا بیان قرآن مجید میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً عقائد‘ نبوات اور سمعیات کا۔ اسی طرح زمین و آسمان اور نفوس کی تخلیق کے ذکر سے ان کے حدوث کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ یہ سب محدث اور صانع کے وجود پر موقوف ہیں۔ باطل مذاہب کی طرف بھی اشارات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اہل تثلیث‘ ثنویت کے قائلین اور مادہ پرستوں کا رد کیا جاتا ہے۔ اہل باطل اور منکروں کے شبہات کا جواب دیا جاتا ہے‘ کبھی وجودی طور پر دکھلا کر اور کبھی امکان کو ثابت کر کے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ﴾ (الانبیاء:۱۰۴)

’’ہم اسے دوبارہ اسی طرح لوٹا دیں گے جس طرح ہم نے پہلے بنایا تھا۔‘‘

اور:

﴿قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ ۙ﴿۷۹﴾﴾

’’آپ جواب دیجیے! کہ انہیں وہ زندہ کرے گا جس نے انہیں اول مرتبہ پیدا کیا ہے‘ جو سب طرح کی پیدائش کا بخوبی جاننے والا ہے۔‘‘

اسی طرح:

﴿الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَاۤ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ﴿۸۰﴾﴾ (یٰس)

’’وہی جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کر دی جس سے تم یکایک آگ سلگاتے ہو۔‘‘

(پہلی دو آیات میں امکان کا بیان ہے۔ تیسری آیت میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔)

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کے دلائل کا تائیدی انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت لقمان کی حکمتوں کا ذکر بھی ہے۔ اور بھی بہت کچھ ہے جو سب اگر بیان کیا جائے تو ایک طویل قصہ ہو جائے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان معاملات میں کلام فرماتے ہیں۔ مثلاً علم نجوم اور آفتوں اور بیماریوں کے ایک انسان سے دوسرے انسان کو لگ جانے کے بارے میں عربوں کے اعتقاد کو باطل قرار دیا ہے۔ اور بھی بہت سے دوسرے مسائل میں کلام فرمایا۔ اور یہ (علم الکلام کو امام اشعری سے پہلے کا قرار دینا) اس صورت میں ہے کہ اس علم کو علم الٰہیات (یا مابعد الطبیعیات) سے الگ شمار کیا جائے۔ اور اگر اسے الٰہیات (یا مابعد الطبیعیات) ہی قرار دیا جائے کہ اس کو تنقیح کے عمل سے گزارنے کے بعد حق کو باطل سے الگ کر کے ملت نے قبول کیا ہے‘ تو پھر اس بات میں کوئی شک ہی نہیں کہ اس علم کی وضع بہت قدیم ہے۔‘‘ (الیوسیؒ کا کلام ختم ہوا)

ہمارے مشائخ کے شیخ‘ علامہ امیر یعنی الیوسی فرماتے ہیں: ’’مشہور ہے کہ امام اشعری اس علم کے وضع کرنے والے ہیں۔ اصل میں ایسا نہیں ہے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان معاملات میں کلام فرمایا ہے۔ امام مالک نے تو ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔ ہاں یہ درست ہے کہ آپ نے باقیوں کی نسبت اِس علم توحید سے زیادہ اعتناء کیا ہے۔‘‘ (شیخ علیش کے فتاویٰ سے کلام ختم ہو گیا) (فتح العلی المالک فی الفتوی علی مذهب الامام مالک: ۱۸/۱‘ طبعہ سنۃ ۱۹۵۸ء)

ان کے علاوہ علم توحید میں بہت سا کلام اکابرِ صحابہ اور خاص طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ جو بھی اسلاف سے اس علم کے بارے میں معانی حاصل ہوئے‘ اکثر علماء نے ان پر ہی اعتماد کرتے ہوئے اس کی شرح و وضاحت کی‘ اس کو وسعت دی اور اس پر علم کی مکمل شاندار عمارت تعمیر کی۔ جو ہم نے علماء کا کلام نقل کیا ہے وہ اس بات کو بیان کرنے کے لیے کافی ہے کہ امام اشعری امامِ اہلِ سُنّت والجماعت ہیں اور اشاعرہ اہلِ سُنّت والجماعت کے حقیقی نمائندہ ہیں۔ اس بات کی وہی مخالفت کرسکتا ہے جو ہمارے ان علماء کی قدر و منزلت سے واقف نہیں ہے جو اُمّتِ مُسلمہ کے لیے روشنی کے میناروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

امام اشعریؒ کی زندگی کے دو اَدوار

گزشتہ بحث سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ امام اشعری کی زندگی کے دو ادوار ہیں۔ پہلا جب وہ معتزلہ کے افکار کے قائل تھے اور ان کا دفاع کیا کرتے تھے‘ بلکہ وہ ان کے بڑے لوگوں میں سے تھے یہاں تک کہ وہ چالیس سال کی عمر تک پہنچ گئے۔ اس بارے میں ہم حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے کہ آپ کا عبوری دور کب شروع ہوا‘ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسا آپ کی فکری ترقی و عروج کے آغاز سے ہی ہو گیا تھا کیونکہ آپ بچپن ہی سے معتزلہ کے ساتھ اختلاط رکھتے تھے۔ اس عبوری دور میں آپ برسوں رہے‘ جس کے آخری حصے میں آپ نے اپنے اور معتزلہ کے فکر کو پرکھنا شروع کیا اور ان کے مشائخ سے مناظرے کیے۔ یہ وہی درمیانی دور ہے جس کا تذکرہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ آخر کار معتزلہ کے بہت سے اصولوں کا غلطی پر ہونا آپ پر واضح ہو گیا۔ آپ کا فکری سفر معتزلہ سے علیحدگی اور اہلِ سُنّت کی طرف رجوع کا باعث بنا۔ پھر آپ نے پہلے گزرے ہوئے علماء و متکلمین مثلاً قلانسی اور حارث محاسبی وغیرہ کی کاوشوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

امام اشعری نے اہلِ سُنّت کی آراء کی توضیح و تنقیح میں تصنیف و تالیف بھی فرمائی اور مخالفین کا ردّ کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کاوشوں کا اثر دیگر علماء نے محسوس کیا‘ جنہوں نے اقوالِ اہلِ سُنّت پر آپ کی حُجت کو تسلیم کیا اور اپنی نسبت آپ کی طرف کی۔ اس دوسرے مرحلہ کے بارے میں غالب گمان یہی ہے کہ کوئی ۲۴ سال رہا۔ یہ مرحلہ تیسری صدی ہجری سے شروع ہوا اور آپ کی وفات پر ہی ختم ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے!

(جاری ہے)

❁❁❁

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

مباحثِ عقیدہ (۲۶)

مؤمن محمود

لَا یَکُوْنُ اِلَّا مَا یُرِیْدُ

آج ان شاء اللہ ''لَا یَکُوْنُ اِلَّا مَا یُرِیْدُ'' کا بیان ہوگا' یعنی ''نہیں ہوتا مگر جو خدا چاہتا ہے۔'' یہ عقیدہ طحاویہ کی عبارت ہے۔ علماء نے کہا ہے کہ یہ تقدیر کے عقیدے کا پورا بیان ہے' یعنی اگر ایک جملے میں تقدیر کے عقیدے کو بیان کرنا ہو تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مشیت' اس کے ارادے اور اس کے علم کے بغیر کائنات میں کچھ نہیں ہوتا۔ چاہے کسی مسلمان کا اسلام ہو یا کسی کافر کا کفر یا کسی منافق کا نفاق' ایجاد ہو یا اعدام' احیاء ہو یا اماتہ' رزق ہو یا جو بھی افعال اس کائنات میں جاری ہیں' وہ سب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم' اس کی مشیت اور اس کے ارادے کے مظاہر ہیں۔ پس ''لَا یَکُوْنُ اِلَّا مَا یُرِیْدُ'' یہی عقیدۂ قدر ہے۔ البتہ اس عقیدے کی کچھ وضاحت اور تفصیلات ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہمیں اس خوش فہمی سے نکل جانا چاہیے کہ یہ عقیدہ بہت آسان اور سادہ ہے' جسے سمجھنا بآسانی ممکن ہے۔ اس طرح کے دعوے کہ چند منٹ' یا ایک گھنٹے یا دس نشستوں میں اس کا حل ہو جائے گا' سب فضول ہیں اور علماء نے اس کو پسند نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس بیان کیا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے جو بیان کیا جائے گا وہ خود امام طحاوی علیہ الرحمہ کا قدر کے بارے میں متن ہے' صرف یہ دکھانے کے لیے کہ تیسری صدی میں بھی علماء کس نگاہ سے عقیدۂ قدر کو دیکھ رہے تھے۔

امام طحاوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

وَأَصْلُ الْقَدَرِ سِرُّ اللّٰهِ تَعَالٰی فِي خَلْقِهِ لَمْ يَطَّلِعْ عَلٰى ذٰلِكَ مَلَكٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نَبِيٌّ مُرْسَلٌ

''عقیدۂ تقدیر کی اصل اللہ کا وہ راز ہے جو اس کی مخلوقات میں (جاری) ہے کہ جس پر کوئی ملک مقرّب بھی مطلع نہیں ہوا اور نہ کسی نبی مرسل کو اس پر واقفیت حاصل ہوئی۔''

وَالتَّعَمُّقُ وَالنَّظَرُ فِي ذٰلِكَ ذَرِيعَةُ الْخِذْلَانِ وَسُلَّمُ الْحِرْمَانِ وَدَرَجَةُ الطُّغْيَانِ

''اس میں تعمق کا مظاہرہ کرنا اور غور وفکر کرنا خذلان کی راہ ہے (یعنی یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمت سے دور ہونا ہے)' یہ محرومی کی سیڑھی ہے (یعنی اس سیڑھی پر چڑھ کر انسان اللہ کے قریب نہیں بلکہ محروم ہوتا ہے) اور یہ سرکشی کے درجے پر قدم رکھنا ہے۔''

فَالْحَذَرَ كُلَّ الْحَذَرِ مِنْ ذٰلِكَ نَظَرًا وَ فِكْرًا وَ وَسْوَسَةً

''پس پوری طرح بچو اس سے' (یعنی اس عقیدۂ تقدیر میں) غور وفکر کرنے سے' نظر دوڑانے سے اور

وسوسوں سے بچو۔''

فَإِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی طَوَی عِلْمَ الْقَدَرِ عَنْ أَنَامِہٖ وَنَہَاھُمْ عَنْ مَرَامِہٖ

''کیونکہ اللہ تعالیٰ نے علمِ قدر کو مخلوقات سے لپیٹ لیا ہے (یعنی کسی کو اس کا علم نہیں دیا) اور مخلوقات کو منع کیا ہے کہ اس کی تلاش میں پڑیں۔''

عقیدۂ تقدیر: ماورائے عقل ہے‘ خلافِ عقل نہیں

بعض چیزیں اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے مخفی رکھی ہیں لیکن انہیں ترغیب دی ہے کہ اگر تم اس راہ پر چلو گے تو واضح کر دوں گا۔ البتہ یہاں فرمایا کہ علمِ قدر لپیٹ بھی لیا ہے اور ساتھ منع بھی کیا ہے کہ اس کی تلاش میں نہ پڑنا‘ کیونکہ یہ عقل سے ماورا ہے؛ خلافِ عقل نہیں ہے‘ ماورائے عقل ضرور ہے۔ ہمارے تمام علماء کے پاس جب عقیدۂ تقدیر کے اصل مقام پر آ کر بات مشکل ہوتی ہے تو آخری پناہ گاہ یہی آیت ہے جو انہوں نے بیان فرمائی:

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِي كِتَابِهٖ: ﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿٢٣﴾﴾ (الانبیاء)

''جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا: اللہ سے سوال نہیں ہوتا کہ وہ کیوں کرتا ہے لیکن ان سے (مخلوقات سے) سوال ضرور ہوگا (کہ یہ کیوں کرتے ہیں)۔''

فَمَنْ سَأَلَ لِمَ فَعَلَ؟ فَقَدْ رَدَّ حُكْمَ الْكِتَابِ وَمَنْ رَدَّ حُكْمَ الْكِتَابِ كَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ

''پس جس نے (اللہ تعالیٰ سے) یہ سوال کیا کہ (تو نے) کیوں کیا‘ تو اس نے کتاب کے حکم کو رد کر دیا۔ اور جس نے کتاب کے حکم کو رد کر دیا وہ کافروں میں سے ہو گیا۔''

یہ عبارت بہت ہی صریح ہے‘ جس میں بتایا گیا ہے کہ قدر کی اصل ایک پنہاں راز ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ کے آخری شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری علیہ الرحمہ کی ایک بہت دقیق کتاب ہے جس کا نام ہے: ''موقف البشر تحت سلطان القدر'' (سلطانِ قدر کے تحت انسان کا موقف)۔ اس کے آخر میں انہوں نے مسئلہ تقدیر کو حل کرنے کی بہت کوشش کی کیونکہ وہ بہت بڑے متکلّم تھے‘ لیکن پھر بالکل تواضع سے بتاتے ہیں کہ وہ مسئلہ حل نہیں ہوا‘ بس زیادہ سے زیادہ تقریب کی ہے‘ آخر کار مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ انہوں نے بہت خوب صورت بات کی کہ جو بھی یہ دعویٰ کرے کہ یہ مسئلہ سادہ ہے‘ سمجھنے میں بہت آسان ہے‘ بآسانی سمجھایا جا سکتا ہے اور بآسانی سمجھ آ جاتا ہے اور بآسانی حل ہو جاتا ہے‘ تو جو بھی یہ کہے گا وہ عقیدۂ تقدیر بیان کرتے وقت ضرور کوئی نہ کوئی بات غلط بیان کرے گا۔ یعنی وہ اہلِ سُنّت کا عقیدہ بیان نہیں کر رہا ہو گا‘ کیونکہ اہلِ سُنّت کا عقیدہ اتنا سادہ نہیں ہے۔

عقیدۂ تقدیر: ماہیت نہیں بلکہ اہمیت

یہ بیان عقیدۂ قدر کی ماہیت کا نہیں بلکہ صرف اس بات کا تھا کہ عقیدۂ قدر کی اہمیت کیا ہے۔ اس کا علم ہم سے مطوی ہے یعنی لپیٹ لیا گیا ہے‘ اور ہمیں منع کر دیا گیا ہے کہ ہم اس کی کھود کرید کریں۔ البتہ اس کا قطعاً یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس مسئلے کا صحیح طریقے پر بیان کرنے سے بھی منع فرمایا ہو۔ آپ ﷺ نے اس مسئلے کو کھول کر بیان کیا ہے۔ عقیدۂ قدر کے ارکان کیا ہیں اور کن کن باتوں کو ماننا ضروری ہے‘ یہ سب باتیں

کھول کر بیان فرمائی ہیں۔ سب سے پہلے ایک حدیث پڑھتے ہیں جس سے یہ بات واضح ہو جائے کہ رسول اکرم ﷺ کو اس مسئلے میں گفتگو پسند نہیں تھی۔ امام احمد بن حنبل علیہ الرحمہ اپنی مسند میں روایت کرتے ہیں:

عَنْ عَمرو ابْنِ شُعَيْبٍ عَنْ جَدِّهِ، قال: خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ وَالنَّاسُ يَتَكَلَّمُوْنَ فِيْ الْقَدَرِ، قَالَ: وَ كَأَنَّمَا تَفَقَّأَ فِيْ وَجْهِهٖ حَبُّ الرُّمَّانِ مِنَ الْغَضَبِ، قَالَ: فَقَالَ لَهُمْ: ((مَا لَكُمْ تَضْرِبُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ بَعْضَهُ بِبَعْضٍ؟))

''حضرت عمرو بن شعیب اپنے دادا (حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن نبی اکرم ﷺ (اپنے حجرۂ مبارکہ سے) باہر تشریف لائے اور لوگ قدر کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ (راوی فرماتے ہیں کہ) یہ سن کر نبی ﷺ کا چہرہ اتنا سرخ ہو گیا گویا انار کے دانے آپ کے چہرے پر نچوڑ دیے گئے ہوں (یعنی جیسا سرخ رنگ انار کا ہوتا ہے اس طرح آپ ﷺ کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا)۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی کتاب کے ایک حصے کو دوسرے سے ٹکراتے ہو!''

گویا صحابہ کرام ؓ کے درمیان گفتگو یہ چل رہی تھی کہ کچھ صحابہ کہہ رہے تھے کہ دیکھو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات بھی نازل فرمائی ہیں جن میں عمل کی نسبت انسان کی طرف کی گئی ہے' انسان کی طرف ارادے کی نسبت بھی ہے اور مشیت کی نسبت بھی ہے۔ اس کے مقابلے میں کچھ صحابہ ایسے ہوں گے جو کہہ رہے ہوں گے کہ نہیں' ادھر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر اللہ چاہے تو یہ ہو جائے' اور تم چاہ بھی نہیں سکتے مگر یہ کہ اللہ چاہے' اور اگر اللہ چاہتا تو تمام انسان مسلمان ہوتے' اور کوئی شخص اللہ کے اذن' ارادے اور مشیت کے بغیر ایمان نہیں لاتا۔ یہ ساری آیات بھی تو قرآن میں موجود ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((بِهٰذَا هَلَكَ مَن كَانَ قَبْلَكُمْ)) قَالَ: فَمَا غَبَطْتُ نَفْسِيْ بِمَجْلِسٍ فِيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَشْهَدُهُ، بِمَا غَبَطْتُ نَفْسِيْ بِذَالِكَ الْمَجْلِسِ، أَنِّيْ لَمْ أَشْهَدْهُ.

''اسی طریقے سے تم سے پہلے لوگ ہلاک ہوئے تھے۔'' (راوی کہتے ہیں کہ) ''جب بھی نبی ﷺ کسی مجلس میں ہوتے تھے اور میں وہاں نہ ہوتا تو میری شدید خواہش ہوتی تھی کہ کاش میں وہاں ہوتا' سوائے اس مجلس کے کہ یہاں میری خواہش یہ ہوئی کہ کاش میں اس مجلس میں نہ ہوتا۔''

اگرچہ نبی ﷺ موجود تھے لیکن چونکہ آپ ﷺ نے شدید غصے کا اظہار فرمایا تو راوی فرماتے ہیں کہ میری خواہش ہوئی کہ کاش میں اس مجلس میں حاضر ہی نہ ہوتا' اگرچہ ہر اُس مجلس میں حاضر ہونے کی میرے دل میں خواہش رہتی تھی جس میں اللہ کے رسول ﷺ بنفسِ نفیس موجود ہوتے تھے۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ یہ بات نبی مکرم ﷺ کو پسند نہیں تھی' خصوصاً جیسا کہ ''الجام العوام'' میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہم عوام ہی میں سے ہیں۔ جس طرح ایک اصطلاح ہے اخص الخواص' تو اس کے مقابلے میں ہم عام العوام ہیں۔ کچھ خواص ہیں اور کچھ اخص الخواص ہیں' اسی طرح کچھ عوام ہیں اور کچھ عام العوام۔ چونکہ ہم عام

العوام ہیں لہٰذا ہمارے لیے بالکل مناسب نہیں کہ ہم ان مسائل میں گفتگو کریں اور ان کو حل کرنے کا دعویٰ کریں۔ جہاں نبی اکرم ﷺ نے اس سے منع فرمایا وہیں آپ ﷺ نے عقیدۂ تقدیر کو کھول کر بیان بھی فرمایا۔ گویا عقیدۂ تقدیر کا صحیح بیان تو مطلوب ہے لیکن عقیدۂ تقدیر کے بارے میں اپنی عقلی موشگافیاں پسندیدہ نہیں ہیں۔ اب دیکھتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ کی احادیث میں عقیدۂ قدر کی اہمیت کیا ہے اور صحابہ کے ہاں اس کا کیا مقام تھا!

قدریہ

مشہور حدیث ہے جسے حدیثِ جبرائیل کہا جاتا ہے' لیکن اس کا ایک پس منظر بھی ہے۔ ایک تابعی یحییٰ بن معمر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم بصرہ میں تھے۔ وہاں صحابہ کے زمانے میں ایک صاحب پیدا ہوئے جن کا نام معبد الجہنی تھا۔ یہ قدریہ کے بانی تھے اور قدریہ کا نعرہ یہ تھا: لَا قَدَرَ وَ الْاَمْرُ اُنُفٌ یعنی تقدیر کوئی شے نہیں ہے اور معاملہ ابھی شروع ہو رہا ہے۔ ابھی شروع ہونے سے مراد یہ ہے کہ پہلے سے کچھ نہیں ہے۔ نہ پہلے سے علم ہے اور نہ پہلے سے ارادہ ہے۔ لہٰذا یہ جو قدریہ اوائل تھے' یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم کے بھی منکر تھے' اگرچہ معتزلہ علم کے منکر نہیں ہیں۔ اسی بنا پر ان قدریہ کی تکفیر بھی ہوئی ہے اور صحابہ نے فرمایا کہ اللہ کے رسول ﷺ ان سے بری ہیں۔ یحییٰ بن معمر فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے بصرہ میں معبد الجہنی نے یہ گفتگو شروع کی۔ میں اور حمید بن عبدالرحمٰن الحمیری' جو یمن کے ایک صاحب تھے' ہم نے باہم طے کیا کہ ہم حج یا عمرہ کے لیے جب مکہ اور مدینہ جائیں گے تو کسی صحابیٔ رسول ﷺ سے ملاقات کر کے ان سے یہ مسئلہ دریافت کریں گے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔

فَانْطَلَقْتُ أنا و حُمَيْدُ بْنُ عبدِ الرَّحمٰنِ الحِمْيَرِيُّ حاجَّيْنِ أو مُعتمِرَيْنِ، فَقُلْنَا: لَوْ لَقِيْنَا أَحَدًا مِنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَسَأَلْنَاهُ عَمَّا يَقُوْلُ هٰؤُلَاءِ فِي الْقَدَرِ

''تو میں اور حمید بن عبدالرحمٰن الحمیری حج یا عمرہ کے ارادے سے روانہ ہوئے' ہم نے (دل میں) کہا کہ کاش ہمیں اصحابِ رسول ﷺ میں سے کوئی مل جائے تو ہم ان سے پوچھیں کہ یہ لوگ جو قدر کے بارے میں کہہ رہے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔''

یہ بھی ایک برکت اور نعمت تھی کہ اس زمانے میں کچھ اصحاب رسولؐ موجود تھے۔ گویا یہ کہہ رہے ہیں کہ نئی نئی باتیں پیدا ہو رہی ہیں تو رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے جا کر پوچھ لیتے ہیں۔

فَوُفِّقَ لَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ دَاخِلًا المَسْجِدَ، فَاكْتَنَفْتُهُ أَنَا وَصَاحِبِيْ أَحَدُنَا عَنْ يَمِيْنِهِ، وَالْآخَرُ عَنْ شِمَالِهِ

''ہمیں توفیق یوں حاصل ہوئی کہ مدینہ کی مسجد میں داخل ہوتے وقت حضرت عبداللہ بن عمرؓ مل گئے۔ میں نے اور میرے ساتھی نے انہیں گھیر لیا' ایک ان کی دائیں طرف کھڑا ہو گیا اور دوسرا بائیں طرف۔''

فَقُلْتُ: أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ إِنَّهُ قَدْ ظَهَرَ قِبَلَنَا نَاسٌ يَقْرَؤُوْنَ الْقُرْآنَ، وَ يَتَقَفَّرُوْنَ الْعِلْمَ، وَ ذَكَرَ مِنْ شَأْنِهِمْ، وَأَنَّهُمْ يَزْعُمُوْنَ أَنْ لَا قَدَرَ، وَ أَنَّ الْأَمْرَ أُنُفٌ

''میں نے کہا: اے ابو عبدالرحمٰن (یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی کنیت تھی)! ہمارے ہاں کچھ لوگ پیدا

ہوئے ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں اور علم کی کھوج میں رہتے ہیں‘ اور ان کا دعویٰ ہے کہ تقدیر کوئی شے نہیں اور معاملہ ابھی شروع ہو رہا ہے۔‘‘

القرآنیون

یہاں ایک عجیب مماثلت ہے جو علماء کو ہمیشہ سے تشویش میں مبتلا رکھتی ہے کہ جو لوگ ’’قرآن قرآن‘‘ کا بہت زیادہ نعرہ لگاتے ہیں‘ ان کے ہاں کچھ گمراہیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں بھی ’’اہلِ قرآن‘‘ کے نام سے ایک گروہ پیدا ہوا جو اصلاً منکرین حدیث تھا‘ اور عرب دنیا میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں ’’القرآنیون‘‘ کہا جاتا ہے اور یہ اپنی نسبت قرآن کی طرف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد علیہ الرحمہ نے بھی اپنی کتاب ’’جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی‘‘ میں یہ نقل کیا ہے کہ جو بھی تحریک قرآن کے نام پر کھڑی ہوتی ہے تو علماء کو تشویش پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ کریں گے‘ کیونکہ یہ ’’قرآن قرآن‘‘ کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اب دیکھیے کہ یہ دو حضرات بھی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آئے اور کہہ رہے ہیں کہ ’’یقرأون القرآن‘‘ (یعنی یہ لوگ قرآن بہت پڑھتے ہیں)‘ اور ان کے بارے میں کچھ اور باتیں بھی بتائیں۔ ویسے تو قرآن پڑھنا اچھی بات ہے‘ لیکن اس میں اشارہ یہ تھا کہ سُنّت وغیرہ کو یہ کوئی حیثیت نہیں دیتے۔ لہٰذا ہم آپ سے پوچھنے آئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی کوئی حدیث بیان فرمائیے جس سے یہ مسئلہ واضح ہو جائے۔

قَالَ: فَإِذَا لَقِيتَ أُولَئِكَ فَأَخْبِرْهُمْ أَنِّي بَرِيءٌ مِنْهُمْ، وَأَنَّهُمْ بُرَءَاءُ مِنِّي، وَالَّذِي يَحْلِفُ بِهِ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ لَوْ أَنَّ لِأَحَدِهِمْ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا فَأَنْفَقَهُ مَا قَبِلَ اللَّهُ مِنْهُ حَتَّى يُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ

’’حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا: جب تم واپس جا کر ان سے ملو تو انہیں بتا دینا کہ میں ان سے بری ہوں اور وہ مجھ سے بری ہیں۔ (بعض روایات میں آتا ہے کہ ’’ورسول اللّٰہ‘‘ یعنی اللہ کے رسول بھی ان سے بَری ہیں۔) فرمایا: اس ہستی کی قسم جس کی قسم عبداللہ بن عمر کھاتے ہیں‘ اگر ان میں سے کسی کے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا ہو اور وہ اسے خرچ کر دے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس سے قبول نہیں فرمائے گا جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہ لے آئے۔‘‘

یہ بات بہت سی روایات میں موجود ہے۔ ہم ساری روایات نقل نہیں کریں گے‘ لیکن صحابہ سے یہ بات تواتر کے درجے میں پہنچی ہوئی ہے کہ جب تک ایمان بالقدر نہ ہو‘ کوئی نیکی قبول نہیں ہوتی‘ جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما یہاں فرما رہے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا: ’’حَدَّثَنِي أَبِي عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ‘‘ اور پھر حدیثِ جبرائیل بیان فرمائی۔ گویا یہ اس حدیث کا سیاق وسباق ہے‘ اور اس میں شاہد و دلیل یہ ہے کہ جب سیدنا جبرائیل علیہ السلام نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ایمان کے بارے میں دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

((أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ، وَ مَلَائِكَتِهِ، وَ كُتُبِهِ، وَ رُسُلِهِ، وَ الْيَوْمِ الْآخِرِ، وَ تُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ)) (صحيح مسلم، كتاب الايمان)

''یعنی اللہ پر' اس کے فرشتوں پر' اس کی کتابوں پر' اس کے رسولوں پر اور یومِ آخرت پر ایمان لاؤ' اور تقدیر پر ایمان لاؤ' چاہے وہ خیر ہو یا شر' سب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہے۔''

اسی طرح کی بہت سی روایات نقل کی گئی ہیں جن میں صحابہ فرماتے ہیں کہ ہم ایسے لوگوں سے' خاص طور پر معبد الجہنی اور اس کے گروہ سے' بے زار ہیں اور یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہیں رکھتے' جن کا دعویٰ تھا: ''لَا قَدَرَ وَ الْاَمْرُ اُنُفٌ''۔

امام مالک نے ''موطا'' میں ایک روایت نقل کی ہے کہ سہیل بن مالکؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے پاس تھا تو ان سے پوچھا گیا: قدریہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ تم ان سے توبہ کرواؤ' اگر توبہ کر لیں تو فبہا' اور اگر نہ کریں تو قتل کر دو۔ بعض علماء نے اس سے یہ استدلال کیا کہ گویا یہ مرتد ہیں۔ صحابہؓ نے بھی ان سے براءت کا اظہار کیا ہے' کیونکہ جب انہوں نے اللہ کی تقدیر کا بالکلیہ انکار کر دیا تو گویا وہ دین سے خارج ہو گئے۔

حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مکالمہ

پھر بہت سی روایات ہیں جن میں نبی اکرم ﷺ نے تقدیر کا عقیدہ بیان فرمایا ہے۔ امام مالک نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک مشہور روایت نقل کی ہے' جو دیگر کتب میں بھی موجود ہے۔ ان روایات کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جہاں رسول اللہ ﷺ نے جھگڑنے سے منع فرمایا ہے' وہاں عقیدۂ تقدیر کا بیان بھی فرمایا ہے' لہٰذا عقیدۂ تقدیر کا صحیح بیان جھگڑنے کے معنی میں نہیں آتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

تَحَاجَّ آدَمُ وَمُوْسٰی ، فَحَجَّ آدَمُ مُوْسٰی

''آدم اور موسیٰ علیہما السلام میں محاجہ (مناظرہ) ہوا' اور آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے''

فَقَالَ لَهُ مُوْسٰی: أَنْتَ آدَمُ الَّذِيْ أَغْوَيْتَ النَّاسَ وَ أَخْرَجْتَهُمْ مِنَ الْجَنَّةِ؟

''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا: کیا آپ وہی آدم ہیں جنہوں نے سب لوگوں کو گمراہ کیا اور انہیں جنت سے نکلوا دیا؟ (یعنی سب وہیں سکون سے ہوتے)''

فَقَالَ آدَمُ: أَنْتَ الَّذِيْ أَعْطَاهُ اللّٰهُ عِلْمَ كُلِّ شَيْءٍ وَاصْطَفَاهُ عَلَى النَّاسِ بِرِسَالَتِه؟ قَالَ : نَعَمْ!

''حضرت آدم علیہ السلام نے جواب دیا: کیا آپ وہی موسیٰ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہر شے کا علم عطا فرمایا اور اپنی رسالت کے ذریعے لوگوں پر چن لیا؟ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا: جی ہاں (میں وہی ہوں)!''

قَالَ : اَفَتَلُوْمُنِيْ عَلٰی أَمْرٍ قَدْ قُدِّرَ عَلَيَّ قَبْلَ أَنْ أُخْلَقَ؟

''حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا: تو کیا تم مجھے اس بات پر ملامت کر رہے ہو جو میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی میری تقدیر میں لکھی جا چکی تھی؟''

نبی مکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے' یعنی حضرت آدم علیہ السلام جیت گئے۔ اس روایت سے کچھ غلط معانی بھی پیدا ہو سکتے ہیں' لیکن اس کے بیان کا مقصد یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ

کے مطابق حضرت آدمؑ کی یہ دلیل بڑی قوی تھی۔ جب حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی اللہ کی یہ منصوبہ بندی طے تھی کہ میں اسی طرح کروں گا‘ جنت سے نکال دیا جاؤں گا اور زمین پر آ جاؤں گا‘ لہٰذا مجھے ملامت نہ کرو۔

اس حدیث کی شرح علماء نے کی ہے‘ کیونکہ اس سے ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں تو منع کیا گیا ہے کہ تقدیر کے ذریعے حُجّت نہ پکڑی جائے‘ جیسا کہ مشرکینِ مکہ حُجّت پکڑتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کا ردّ فرمایا:

﴿لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا﴾ (الانعام:۱۴۸)

’’اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔‘‘

تقدیر سے حُجّت پکڑنے کی جائز صورت

یہاں بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام تقدیر سے حُجّت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ یہاں حجت تقدیر سے حاصل کی جا رہی ہے‘ لیکن علماء نے اس کے جو بہت سے جوابات دیے ہیں ان میں سے ایک بہت قوی جواب یہ ہے کہ یہ حجت توبہ تائب ہونے اور گناہ کی معافی مل جانے کے بعد پکڑی جا رہی ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہوا کہ گناہ کر لیا اور توبہ نہ کی اور تقدیر سے حجت پکڑ لی‘ جیسا کہ ابلیس نے کیا تھا کہ جب اس نے سجدہ نہیں کیا اور کہا گیا کہ کیوں نہیں کیا‘ تو اس نے کہا:

﴿بِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ﴾ (الحجر:۳۹)

’’تو نے مجھے گمراہ کیا‘ (میرا کوئی قصور نہیں)‘‘

جبکہ حضرت آدم علیہ السلام اپنے قصور اور کوتاہی کا اعتراف فرما چکے ہیں:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ســكتة وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۲۳﴾

’’اے ہمارے ربّ‘ ہم نے اپنے اوپر ستم کیا‘ اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔‘‘

گویا جو شخص توبہ تائب ہو چکا ہو اور اللہ کی طرف سے اس کی توبہ کی قبولیت کا پروانہ بھی آ چکا ہو۔ یہ بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی معلوم تھی کیونکہ ان کی کتاب میں بھی یہ ذکر ہے کہ آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہو گئی تھی۔ چنانچہ جب توبہ قبول ہو گئی اور معافی مل گئی‘ اس کے بعد یہ کہنا کہ تمہارا قصور ہے‘ درست نہیں۔ کسی مسلمان کو اس کے اس گناہ پر جس سے وہ توبہ تائب ہو چکا ہو‘ عار نہیں دلائی جا سکتی اور اسے قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ لہٰذا یہ گفتگو توبہ تائب ہو جانے کے بعد کی ہے‘ اور اسی لحاظ سے حضرت آدم علیہ السلام‘ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ اگرچہ اس کے اور بھی کچھ جوابات دیے گئے ہیں‘ لیکن یہ ایک ایسا جواب ہے جس سے‘ ان شاء اللہ‘ اشکال دور ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد ایک مشہور حدیث ہے جسے امام مالک نے اپنی ’’موطا‘‘ میں نقل کیا ہے۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے ایک صاحب نے اس آیت کے بارے میں سوال کیا:

﴿وَاِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّیَّتَهُمۡ وَ اَشۡهَدَهُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی ۚ﴾ (الاعراف:۱۷۲)

یہ مشہور ''آیتِ الست'' ہے۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی سنا کہ ان سے بھی اس آیت کے بارے میں یہی سوال کیا گیا تھا' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو جواب دیا وہی میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهُ بِيَمِينِهِ وَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ: خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلْجَنَّةِ وَبِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ يَعْمَلُونَ))

''اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا' پھر اپنا دایاں ہاتھ (جو اللہ کی شان کے لائق ہے) ان کی پیٹھ پر پھیرا اور وہاں سے ایک ذریت نکالی اور فرمایا: انہیں میں نے جنت کے لیے پیدا کیا ہے' اور یہ اہلِ جنت کے اعمال ہی کریں گے۔''

((ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهُ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ: خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلنَّارِ وَبِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ يَعْمَلُونَ))

''پھر دوبارہ ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور مزید ذریت نکالی اور فرمایا: انہیں میں نے آگ کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ اہلِ نار کے اعمال کریں گے۔''

تقدیر کے ہوتے ہوئے عمل کا فائدہ

فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! فَفِيمَ الْعَمَلُ؟

''تو ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! پھر عمل کس چیز میں ہے؟''

یہی اشکال جو ہمارے ذہنوں میں بھی آتا ہے' وہاں ایک صاحب نے پوچھ لیا: یعنی جب سب طے ہو چکا تو عمل کا کیا فائدہ؟

ایک دوسری صحیح روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں:

((خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلْجَنَّةِ وَ لَا أُبَالِي))

''انہیں میں نے جنت کے لیے پیدا کیا اور مجھے کوئی پرواہ نہیں۔''

یہاں ''لا أبالی'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی فعل کے انجام کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا کہ کوئی اس کا بدلہ لے گا یا یہ پوچھے گا کہ یہ کیوں کیا؟ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَلَا یَخَافُ عُقۡبٰهَا ﴿۱۵﴾﴾ (الشمس)

یعنی اللہ کو انجام کا کوئی اندیشہ نہیں۔ اس سوال کے جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی لمبی چوڑی فلسفیانہ تشریح نہیں فرمائی' جیسی ہم پیش کرتے ہیں' بلکہ فرمایا کہ حقیقت یہی ہے' بس اس کا بیان کر دیا۔ جب صحابی نے پوچھا کہ پھر کیا عمل کریں' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ إِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلْجَنَّةِ اسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ، حَتَّى يَمُوتَ عَلٰى عَمَلٍ مِنْ أَعْمَالِ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فَيُدْخِلَهُ بِهِ الْجَنَّةَ))

''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو جنت کے لیے پیدا فرماتا ہے تو اس سے جنت والوں کے اعمال ہی سرزد کرواتا ہے (اللہ اسے اہلِ جنت کے عمل میں استعمال فرماتا ہے)' یہاں تک کہ اس کی موت اہلِ جنت کے اعمال میں سے کسی ایک عمل پر آتی ہے اور اسی کے ذریعے اللہ اسے جنت میں داخل فرما دیتا ہے۔''

اور اس کے برعکس:

((وَإِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلنَّارِ اسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ، حَتَّى يَمُوتَ عَلٰى عَمَلٍ مِنْ أَعْمَالِ أَهْلِ النَّارِ، فَيُدْخِلَهُ بِهِ النَّارَ)) (سنن الترمذی:۳۰۷۵)

''اور جب کسی بندے کو آگ کے لیے پیدا فرماتا ہے تو اس سے اہلِ نار کے اعمال کرواتا ہے' یہاں تک کہ اس کی موت اہلِ نار کے اعمال میں سے کسی ایک عمل پر آتی ہے اور اسی کے ذریعے اللہ اسے دوزخ میں داخل کر دیتا ہے۔''

اسی طرح ایک اور روایت طاؤس الیمانی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قریبی شاگردوں میں سے ہیں اور بہت مشہور ہیں۔ یہ یمن سے آئے تھے۔ وہ فرماتے ہیں:

أَدْرَكْتُ نَاسًا مِنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُولُونَ: كُلُّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے صحابہ سے ملاقات کی' وہ سب فرماتے تھے کہ ہر شے تقدیر کے ساتھ ہے۔''

ذہانت اور بے وقوفی بھی مقدّر ہیں

طاؤسؒ مزید فرماتے ہیں:

سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ يَقُولُ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((كُلُّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ حَتَّى الْعَجْزُ وَالْكَيْسُ))

''میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو کہتے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر شے تقدیر کے ساتھ ہے' یہاں تک کہ عاجزی اور ذہانت بھی۔''

جیسا کہ ہم نے شروع میں قرآن کی یہ آیت نقل کی تھی:

﴿اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝۴۹﴾ (القمر)

''بے شک ہم نے ہر چیز کو تقدیر کے ساتھ پیدا کیا۔''

یعنی ذہانت اور بے وقوفی' یہ سب چیزیں بھی تقدیر ہی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ کسی کو ذہانت زیادہ ملی ہے اور کوئی زیادہ ''کَیِّس'' یعنی زیادہ سوچنے سمجھنے والا ہے۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((النَّاسُ كَالْمَعَادِنِ)) ''لوگ معدنیات کی مانند ہیں۔''

چنانچہ انسانوں کے اندر مختلف صلاحیتیں بھی تقدیر کے ساتھ ہیں۔ اس کے بعد اور بھی بہت سی روایتیں نقل کی گئی ہیں جن میں صحابہ کے اقوال ہیں' اور جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ رسول

اللہ ﷺ ان قدریہ سے بری ہیں۔

ایک اور صحیح روایت ہے جس میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی ذریت نکالی اور فرمایا: ((هَؤُلَاءِ فِي الْجَنَّةِ وَلَا أُبَالِي)) یعنی یہ جنت میں ہیں، مجھے پرواہ نہیں۔ یہاں ''لا أبالي'' کا اضافہ ہے۔ ایک پوچھنے والے نے پوچھا: فَعَلَامَ نَعْمَلُ؟ پھر ہم عمل کس بنیاد پر کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((عَلَىٰ مَوَاقِعِ الْقَدَرِ)) یعنی تم تقدیر کے واقع ہونے کی جگہوں پر ہی عمل کرو گے' گویا تمہارا عمل بھی خود تقدیر ہی کا جزو ہوگا۔

اگلی حدیث بھی طویل ہے جس میں رسول اکرم ﷺ بقیع الغرقد میں موجود تھے اور یہی الفاظ ارشاد فرمائے۔ یہ حدیث امام مسلم نے اپنی صحیح میں ''کتاب القدر'' یعنی تقدیر کے بیان میں نقل کی ہے' اور وہ بھی پوری حدیث لے کر آئے ہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سی احادیث ہیں' لیکن ان تمام سے ایک بات واضح ہوجاتی ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے ایک طرف عقیدۂ تقدیر میں جھگڑنے سے منع فرمایا اور دوسری طرف اسے کھول کر بیان بھی فرمایا۔ ہمارے ائمہ نے بھی' جیسا کہ امام طحاوی کی عبارت ہم نے شروع میں دیکھی' یہ بیان فرمایا ہے کہ عقیدۂ تقدیر کے اندر کچھ راز ایسے ہیں جو قابلِ فہم نہیں۔ یہاں ''قابلِ فہم نہ ہونے'' کا مطلب یہ نہیں کہ یہ خلافِ عقل ہیں' بلکہ یہ کہ کچھ باتیں ماورائے عقل ہیں' کیونکہ ان کا تعلق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفتِ ارادہ اور صفتِ قدرت سے ہے۔ چنانچہ جہاں ہمارے علماء اور نبی ﷺ نے ان معاملات میں جھگڑنے سے منع فرمایا ہے' وہیں ان معاملات کو کھول کر یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ عقیدہ رکھنا کیا ہے۔

عقیدۂ تقدیر پر متجددین کا حملہ

پچھلی صدی کی ابتدا میں جب مغرب کا غلبہ ہوا تو کچھ لوگوں کے ہاں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ مسلمانوں کا عقیدۂ تقدیر ہے جس نے انہیں پیچھے چھوڑ دیا؛ یہ لوگ ہر بات کو اللہ کی طرف سے سمجھتے ہیں اور ہر بات پہلے سے طے شدہ مانتے ہیں' یہ طرزِ عمل عمل چھوڑنے پر آمادہ کرتا ہے۔ لہٰذا مسلمان پیچھے رہ گئے اور دوسری دنیا آگے نکل گئی۔ چنانچہ (ان کے خیال میں) یا تو مسلمانوں نے عقیدۂ تقدیر کو صحیح نہیں سمجھا' اور اگر صحیح سمجھ بھی لیا ہے تو اس کے اندر کچھ مسائل ہیں۔ ایک پوری فکری رَو چلی جو مفتی محمد عبدہ علیہ الرحمہ سے شروع ہوئی اور پھر ان کے شاگردوں اور شیوخِ ازہر تک پہنچی۔ مثال کے طور پر اس وقت شیخ بخیت رحمہ اللہ ایک بڑے عالم تھے' اسی طرح شیخ شلتوت بھی شیوخِ ازہر میں سے تھے' اور مفتی محمد عبدہ کے شاگردوں میں سید رشید رضا تھے۔ پھر ہندوستان میں بھی اسی طرح کچھ ہوا۔ مغرب کا غلبہ قائم تھا اور ہر جگہ یہی صورت حال تھی۔ لہٰذا عقیدۂ تقدیر پر بھی حملے ہوئے اور بہت سی جگہوں پر عقیدۂ تقدیر کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے ایک ایسا موقف اختیار کیا گیا جو اہلِ سُنّت کا نہیں تھا' لیکن اسے اہلِ سُنّت کے نام پر پروموٹ کیا گیا۔

شیخ مصطفیٰ صبری کی کتاب ''موقف البشر تحت سلطان القدر'' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی بڑے بڑے علماء عقیدۂ تقدیر میں معتزلی ہوگئے تھے' اور شیخ نے ان کا زبردست طریقے سے ردّ فرمایا ہے۔ عقیدۂ

تقدیر پر جدید وقدیم کے حوالے سے متعدد کتابیں پڑھی ہیں اور یہ مسائل کچھ دیکھے ہیں‘ لیکن اس ناقص مطالعے میں شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری کی کتاب سے بڑھ کر کوئی ایسی کتاب نظر نہیں آئی جس میں صحیح طریقے پر مسئلے کا احاطہ کیا گیا ہو اور محلِ نزاع یعنی جھگڑے کی اصل جگہ کو پہلے واضح کیا گیا ہو۔ بہت سی کتابوں میں مصنّفین لکھتے چلے جاتے ہیں‘ لیکن جو اصل بات ہے جہاں آ کر پھنسنا ہوتا ہے‘ وہ مقام درمیان میں کہیں آتا ہی نہیں‘ اور تمام مسائل بظاہر حل بھی ہو جاتے ہیں۔ اسے ایک اصطلاح میں ’’تسويدُ البياض‘‘ کہا جاتا ہے‘ یعنی صفحے پر صفحے لکھتے چلے جانا‘ بیاض کو سیاہ کرتے چلے جانا‘ لیکن بالآخر مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ایسی بہت سی کتابیں ہیں اور کچھ بڑے بڑے لوگوں کی بھی ایسی کتابیں ہیں جنہوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔

اس کے مقابلے میں الانتباهات المفیده میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ نے صرف دو تین صفحے عقیدۂ تقدیر پر لکھے ہیں‘ لیکن انہوں نے فوراً اس مسئلے کو پہچان لیا جو اس زمانے میں ہو رہا تھا۔ ہندوستان میں بھی کچھ بڑے بڑے علماء یہی کام کر رہے تھے‘ تو آپ نے فوراً پہچان لیا کہ یہ معتزلی موقف ہے‘ یہ عقیدۂ تقدیر نہیں بلکہ اس کی غلط تفسیر ہے۔ لہٰذا انہوں نے مختصراً بیان فرما دیا کہ جو عقیدہ تم اس وقت بیان کر رہے ہو‘ یہ عقیدۂ تقدیر نہیں ہے۔ شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری علیہ الرحمہ نے تمام مواقف کھول کر بیان کر دیے ہیں۔ یہ سارے مواقف یہاں بیان نہیں کیے جائیں گے‘ کیونکہ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا‘ ان باتوں سے منع کیا گیا ہے۔ البتہ یہ موقف چاہے قدریہ کا ہو یا جبریہ کا‘ یا ان کے درمیان کے بہت سے مواقف ہوں جنہیں معتزلہ‘ اشاعرہ‘ ماتریدیہ‘ امام الحرمین الجوینی‘ اور ابن تیمیہ وابن قیم علیہم الرحمہ کا موقف کہا جاتا ہے‘ تو یہ درمیانی مسالک ہیں جو سب کسی نہ کسی درجے میں اہلِ سُنّت میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک انتہا قدریہ کی ہے اور ایک انتہا جبریہ کی‘ اور سوائے معتزلہ کے‘ جنہیں میں نے درمیان میں شمار کیا ہے‘ باقی سب اہلِ سُنّت میں شمار ہوتے ہیں؛ معتزلہ اہلِ سُنّت میں شمار نہیں ہوتے۔

قدریہ کا موقف

پہلے صرف دونوں انتہاؤں کا بیان مناسب ہے کہ جبریہ کون ہیں اور قدریہ کون ہیں‘ اور کیا ان دونوں کی تکفیر ہوئی ہے؟ قدریہ دو قسم کے ہیں: ایک قدریہ اوائل ہیں اور ایک قدریہ اواخر ہیں جنہیں معتزلہ کہا جاتا ہے۔ اور دوسری انتہا پر جبریہ ہیں۔ قدریہ اوائل کا موقف یہ تھا: ’’لا قدر و الأمر أنف‘‘ یعنی کوئی تقدیر نہیں ہے اور (ہر) معاملہ ابھی (اسی وقت) شروع ہوتا ہے۔ نہ کوئی پہلے سے علم ہے اور نہ ارادہ۔ انہوں نے کہا کہ اللہ کا علم ازلی بھی نہیں ہے‘ یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہر چیز کو پہلے سے جانا ہوا بھی نہیں بلکہ معاملات فی الحال ظاہر ہو رہے ہیں۔ گویا سب کچھ حالتِ ارتقا میں ہے۔ اس تصور میں شاید خدا بھی حالتِ ارتقا میں ہے۔ ان لوگوں کی تکفیر ہوئی ہے جنہوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علمِ ازلی کا انکار کر دیا۔ انہوں نے علمِ ازلی کا انکار کیوں کیا؟ ان کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ انسانی ارادے کو آزاد کیا جائے‘ کیونکہ یہ مسئلہ انتہائی معرکۃ الآراء اور محیّر العقول مسائل میں سے ہے۔ مسئلہ یہ پیش آیا کہ انسانی ارادے پر سے جکڑ ختم کی جائے تاکہ انسان اپنے اعمال میں مسئول بنے۔ ان کے نزدیک اللہ کا

علمِ ازلی بھی انسان کو قید کر رہا ہے‘ اور انسان مکلف وجود ہے‘ لٰہذا اس کی تکلیف اور مکلف وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کا نہ ارادہ قدیم ہو اور نہ علم قدیم۔ چنانچہ انہوں نے اللہ کے ارادے اور علم قدیم کو انسان کے ارادے‘ قدرت اور علم پر قربان کر دیا۔ ان کو قدریہ اوائل کہا جاتا ہے۔

جبریہ کا موقف

ان کے برعکس دوسری انتہا پر جبریہ ہیں۔ جبریہ نے کہا کہ قرآن اور احادیث میں تو بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم سابق بھی ہے‘ اللہ کا ارادہ ازلی بھی ہے‘ اللہ ہی کی مرضی سے ہر شے ہوتی ہے: ’’لا یکون إلا ما یرید‘‘ ’’ما شاء اللّٰہ کان وما لا یشاء لا یکون‘‘ یہ ساری نصوص کہاں گئیں؟ انہوں نے کہا کہ یہ نصوص اصل ہیں۔ لٰہذا انہوں نے اِن نصوص پر توجہ مرکوز کی اور اُن نصوص کو چھوڑ دیا جن میں انسان کی طرف ارادے کی نسبت تھی‘ قدرت کی نسبت تھی‘ عمل اور فعل کی نسبت تھی۔ انہوں نے کہا کہ انسان بالکل مجبور ہے‘ مانند اس کے کہ جیسے ہوا چلتی ہے اور پتے یا ٹہنیاں ہلتی ہیں؛ ٹہنی اور پتوں کی حرکت ہر قسم کے ارادے سے خالی ہے‘ بس ہوا آتی ہے اور انہیں ہلا دیتی ہے۔ انسان بھی ایسا ہی وجود ہے۔ انہوں نے انسان کے اختیاری اور اضطراری اعمال میں کوئی تفریق نہیں کی اور کہا کہ انسان پورے کا پورا اضطرار ہے‘ حالانکہ وجدانی طور پر انسان جانتا ہے کہ اس کے کچھ اعمال اضطراری ہیں اور کچھ اختیاری بھی۔ جبریہ کا کہنا ہے: ’’كَمَا تُحَرِّكُ الرِّيَاحُ الْأَغْصَانَ‘‘ جیسا کہ ہوائیں ٹہنیوں کو ہلاتی ہیں‘ اسی طرح تقدیر کی ہوائیں انسان کو ہلاتی رہتی ہیں جس میں کسی قسم کا کوئی ارادہ نہیں۔

جبریہ کی تکفیر ہوئی کہ نہیں؟ امام الحرمین ابوالمعالی الجوینی سے جب یہ پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ ان کی تکفیر اس وقت ہو گی جب یہ تکلیف (شرعی ذمہ داری) کا انکار کریں۔ کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے اس کے نتیجے میں کہا کہ یہ تکلیف اور یہ شریعت سب بے معنی ہے‘ کیونکہ جب انسان کے پاس اختیار ہی نہیں ہے اور چونکہ تکلیف کی بنیاد اختیار پر رکھی گئی ہے لٰہذا تکلیف بھی نہیں۔ جنہوں نے تکلیف اور شریعت کا انکار کر دیا وہ کافر ہو گئے۔ البتہ ایسے لوگ کم تھے۔ ان میں سے اکثر نے کہا کہ انسان کا حال وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے‘ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اسے سزا بھی ملے گی اور جزا بھی‘ تو بس اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے‘ وہ جو چاہے کرے‘ کیونکہ یہ اللہ کی مخلوق ہے اور اللہ سے کوئی سوال نہیں کر سکتا۔ جن لوگوں نے یہ کہا کہ تکلیف اور شریعت برقرار ہے‘ انہیں کافر نہیں کہا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ تم معاملات کو بالکل نہیں سمجھ رہے‘ لیکن چونکہ تم شریعت کا انکار نہیں کر رہے تو تمہیں کافر نہیں کہا جا سکتا۔ ویسے بھی کوئی شخص نظری سطح پر تو جبری ہو جاتا ہے لیکن عملی سطح پر کوئی بھی اس طرح جبری نہیں ہوتا‘ یعنی اگر اسے تھپڑ مارا جائے تو آگے سے ضرور مارے گا‘ اگرچہ یہ کہہ سکتا ہے کہ تھپڑ بھی تقدیر کا حصہ ہے۔

معتزلہ کا موقف

یہ دو انتہائی مواقف ہوئے۔ قدریہ بالکل ایک انتہا پر کھڑے ہیں‘ اور ان سے تھوڑا نیچے اتر کر جو اسلام میں داخل ہیں وہ معتزلہ ہیں‘ جنہیں خاص معنی میں قدریہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے انسان کی طرف

ارادے اور اعمال کی نسبت کی اور کہا کہ انسان اپنے اعمال اور ارادے کا خالق خود ہے؛ اللہ تعالیٰ نے اسے بس ایسا پیدا کر دیا ہے اور وہ اپنی مرضی سے اپنا ارادہ بھی پیدا کرتا ہے اور اپنے اعمال کا خالق بھی ہے۔ البتہ انہوں نے اللہ کے علمِ سابق کا انکار نہیں کیا' ارادۂ سابقہ کا انکار کر دیا۔ یعنی ان کے نزدیک اللہ کے علم میں تو ہے کہ ہونا کیا ہے' علم کے موافق طے ہے اور اللہ نے لکھ دیا ہے' لیکن علم تابعِ معلوم ہوتا ہے' یعنی علم صرف انکشاف کرتا ہے' مجبور نہیں کرتا۔ علم کی صلاحیت انکشاف ہوتی ہے کہ اس سے چیزیں کھل جاتی ہیں' اس سے کوئی مجبور نہیں ہو رہا ہوتا۔ اگر مجھے کسی کے بارے میں یقینی علم حاصل ہو جائے کہ وہ فلاں کام کرے گا' تو میرے علم نے اسے کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ علم کے نتیجے میں جبر لازم نہیں آتا' جبر لازم آتا ہے ارادے کے نتیجے میں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ نے ارادہ ایسا کیا تھا کہ تم ایسا کرو' اور تمہارے اعمال اور ارادوں کا خالق اللہ ہے' تب مسئلہ پیدا ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے کہا کہ ارادۂ الٰہی کو قدیم ماننے سے جبر لازم آتا ہے۔

اگرچہ قدریہ اوائل نے علم کا بھی انکار کیا تھا اور معتزلہ کو بھی خوب پھنسایا تھا کہ علم سے بھی جبر لازم آتا ہے اور تم جبر سے نہیں بچ سکتے' لیکن یہ اور مسائل ہیں۔ صحیح قول یہ ہے کہ معتزلہ کے مسلک میں بھی جبر لازم آتا ہے' لیکن کسی اور درجے پر پہنچ کر۔ بعض مسالک میں جبر بالکل پہلے مرحلے پر لازم آ رہا ہے' بعض میں دوسرے پر' بعض میں تیسرے پر اور بعض میں چوتھے پر۔ یہ معتزلہ کا موقف تھا۔

یہ بات بتانا مقصود تھی کہ اکثر لوگوں نے معتزلہ کا موقف اختیار کر لیا؛ اس کی صورت یہ ہوئی کہ بہت سے لوگوں کی زبانی یہ سنا جاتا ہے کہ اللہ ہر چیز پہلے سے جانتا ہے۔ پھر اس کی مثالیں دی جاتی ہیں کہ جیسے ایک استاد پہلے سے جان لیتا ہے اور اگر وہ اپنے پاس لکھ لے کہ فلاں طالب علم اتنے نمبر لے گا اور فلاں اتنے' تو استاد کا علم تخمینی ہوتا ہے جبکہ اللہ کا علم تخمینی نہیں بلکہ قطعی ہوتا ہے۔ لیکن لکھ لینے سے طالب علم مجبور تو نہیں ہو جاتا کہ اس نے اتنے نمبر ہی لینے ہیں' وہ تو اپنی آزاد مرضی سے لے گا۔ اس طرح کی مثالیں آج کل اہلِ سُنّت میں سے بھی بہت سے لوگ دیتے ہیں اور اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پہلے سے علم سابق تو ہے' لیکن پہلے سے ساری چیزوں کی تقدیر نہیں بنائی گئی' بس علم سابق ہے اور ارادۂ سابقہ نہیں ہے۔ یہ بھی عقیدۂ تقدیر نہیں ہے' کیونکہ یہ بعینہٖ وہی مسلک ہے جو معتزلہ کا تھا۔

یہاں حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے مختصر اقتباس کا ذکر بھی مناسب ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ تفسیر کی غلطی ہے جو تم لوگ کر رہے ہو' اصل بات ایسی نہیں ہے۔ ماضی میں بھی علماء یہی بیان کرتے آئے ہیں اور حضرت تھانویؒ بھی اسی کو بیان کر رہے ہیں۔

الانتباھات المفیدہ اور مسئلۂ تقدیر

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ نے الانتباھات المفیدہ میں ''متعلق مسئلہ تقدیر'' کے عنوان سے اس مسئلے کی وضاحت فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں:

’’مرجع اس مسئلہ کا علم وتصرفِ ارادۂ خداوندی ہے۔‘‘

یعنی شروع ہی میں واضح فرما دیا کہ اس مسئلے کا تعلق علم اور تصرفِ ارادۂ خداوندی‘ دونوں ہی صفات سے ہے‘ محض علم سے نہیں ہے۔ آگے فرماتے ہیں:

’’جو خدا کا اور اس کی صفاتِ کمال کا قائل ہوگا اس کو اس کا قائل ہونا واجب ہوگا۔ مگر اس وقت اس مسئلہ میں بھی چند غلطیاں کی جاتی ہیں۔ بعض تو سرے سے اس کا انکار ہی کرتے ہیں اور بنائے انکار محض ان کا یہ خیال ہے کہ اس مسئلہ کے اعتقاد سے تدبیر کا ابطال ہوتا ہے۔ اور تدبیر کا معطل ہونا اصل بنیاد ہے تمام کم ہمتی وپستی کی۔‘‘

یہی وہ خیال تھا جو اُس وقت ہر جگہ پھیلا ہوا تھا (کہ عقیدۂ تقدیر مسلمانوں کی پستی کا سبب ہے)۔ فرماتے ہیں:

’’اور واقع میں یہ خیال ہی خود غلط ہے۔ کوئی شخص اپنے سوئے فہم سے تدبیر کو باطل و معطل سمجھ جاوے تو یہ مسئلہ اس کا ذمہ دار نہیں۔ لیکن کسی نص نے تدبیر کا ابطال نہیں کیا بلکہ سعی واجتہاد وکسب معیشت وتزود لسفر و تدابیر دفع مفاسد ومکائد عدو وغیرہ بے شمار نصوص میں مصرحاً وارد ہیں۔‘‘

پھر فرماتے ہیں:

’’بعض احادیث میں اس اشکال کا کہ دوا و دعا وغیرہ کیا دافع قدر ہیں‘ کیا مختصر وکافی جواب ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: ذٰلِكَ مِنَ الْقَدَرِ كُلِّهٖ‘‘

یعنی جب نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ ہم جو دعا‘ رقیہ وغیرہ کرتے ہیں ’’هَلْ نَدْفَعُ بِهَا قَدَرَ اللّٰهِ؟‘‘ کیا اس کے ذریعے اللہ کی تقدیر کو دفع کر دیتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ’’هِيَ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ‘‘ یہ بھی تو اللہ کی تقدیر میں سے ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

’’اور بعض نے نصوص صریحہ کو دیکھ کر انکار کی تو گنجائش نہیں دیکھی مگر یہ سمجھ کر کہ اس میں انسان کا مجبور اور غیر مختار ہونا‘ جو کہ خلافِ مشاہدہ ہے‘ لازم آتا ہے‘ اس کی تفسیر بدل ڈالی۔‘‘

یعنی بعض نے کہا کہ انکار تو نہیں کرنا‘ چلو اس کا کوئی نیا فہم نکال لیتے ہیں۔ یہ بہت اہم بات ہے۔ اس مسئلے پر متعدد لوگوں کے رسائل پڑھے‘ ان میں سے بعض میں بات واضح نہیں ہو رہی ہوتی‘ اگرچہ ضخیم رسالے ہوتے ہیں۔ البتہ حضرت تھانویؒ نے یہاں بالکل واضح فرما دیا۔ اگر پرانے علماء کو صحیح طریقے پر پڑھا جائے اور پھر جدید لوگوں کو پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نئے لوگ لکھتے چلے جا رہے ہوتے ہیں‘ لیکن مسئلے کی تقریر اور تحریر نہیں ہو رہی ہوتی؛ بات ہی پتہ نہیں چلتی کہ محلِ نزاع کیا ہے‘ اصطلاحات کی وضاحت نہیں ہوتی‘ بلکہ ابہام ہوتا ہے۔ لکھنے والے کے ذہن میں بھی اور پڑھنے والے کے ذہن میں بھی بات یکساں مبہم رہتی ہے۔ سب سے پہلے اس تعین کی ضرورت ہوتی ہے کہ اختلاف کس جگہ پر ہے‘ اور پھر اصطلاحات کی وضاحت کے ساتھ گفتگو کی جائے۔

بہرحال حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے تفسیر بدل ڈالی:

’’اور اس کی یہ تفسیر قرار دی کہ تقدیر علمِ الٰہی کا نام ہے‘ اور علم چونکہ معلوم میں متصرف نہیں ہوتا‘ اس لیے اس کے تعلق سے وہ اشکال لازم نہیں آتا۔ اور مثال اس کی نجومی کے مطلع ہونے اور اس کے پیشین گوئی کرنے

سے دی کہ اگر وہ کہہ دے کہ فلاں تاریخ فلاں شخص کنویں میں گر کر مر جاوے گا' اور ایسا ہی واقع ہو گیا تو یوں نہ کہیں گے کہ اس نجومی نے قتل کر دیا۔''

یعنی انہوں نے اس مسئلے سے نکلنے کے لیے تفسیر بدل دی۔ تفسیر یہ بدلی کہ تقدیر علمِ الٰہی کا نام ہے اور علمِ الٰہی سے جبر لازم نہیں آتا' لہٰذا اشکال وارد نہیں ہوا۔ اس کی یہی مثالیں آج تک بھی دی جا رہی ہیں: نجومی والی اور استاد والی۔ حضرت تھانویؒ نے یہ سب نقل فرمانے کے بعد جواب دیا:

''لیکن نصوص میں نظر کرنے والا دریافت کر سکتا ہے اور عقلی مسئلہ بھی ہے کہ جس طرح کوئی واقعہ تعلقِ علمِ الٰہی سے خالی نہیں اسی طرح کوئی واقعہ تعلقِ ارادۂ الٰہیہ سے بھی خالی نہیں' اور تقدیر کی یہی حقیقت ہے۔''

یہی اصل مسئلہ ہے اور یہی عقیدۂ تقدیر کا بیان ہے: جس طرح کوئی واقعہ تعلقِ علمِ الٰہی سے خالی نہیں' اسی طرح کوئی واقعہ تعلقِ ارادۂ الٰہیہ سے بھی خارج نہیں' اور تقدیر کی حقیقت یہی ہے۔ پھر فرماتے ہیں:

''اور اگر کوئی شخص اپنی اصطلاح میں اس کا نام تقدیر نہ رکھے' لیکن خود اس تعلق ارادہ کا تو انکار نہیں کر سکتا۔''

یعنی تم تقدیر کا نام بدل کر صرف علم رکھ لو' تو پھر بھی تعلقِ ارادہ باقی رہے گا اور یہ مسئلہ اپنی جگہ برقرار ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو اس زمانے میں وبا کی صورت میں پھیلا اور ایک اعتزالی مذہب غالب آنا شروع ہو گیا۔ مفتی محمد عبدہ علیہ الرحمہ نے بھی مسئلہ تقدیر پر کتاب لکھی اور اس میں اعتزالی مسلک کو ترجیح دی۔ اسی طریقے پر بعد میں آنے والوں کو بھی یہی سمجھ آئی کہ گویا اس مسئلے سے نکلنے کی راہ یہی ہے۔

بہر حال ایک طرف جبریہ تھے اور ایک طرف قدریہ' اور قدریہ سے کچھ نیچے معتزلہ ہیں جن کی تکفیر نہیں کی گئی۔ یہ مسئلہ اتنا محیر العقول اور معرکۃ الآراء کیوں بنا' اس کی ایک وجہ تو بالکل عقلی ہے۔ انسان وجدانی طور پر محسوس کرتا ہے کہ وہ اختیار رکھنے والا وجود ہے اور اسے ذمہ دار بنایا گیا ہے' لیکن دوسری طرف وہ اپنے ارادے کو خارجی عوامل کے تابع بھی محسوس کرتا ہے۔

تصوّرِ جبریت صرف مذہبی نہیں

جبریت (Determinism) کا تصور صرف مذہب کی طرف سے نہیں آیا بلکہ ہر جگہ ایسا ہی ہے؛ پرانے فلسفوں میں بھی ہے اور جدید سائنس میں بھی سائنسی جبریت (scientific determinism) موجود ہے۔ انسان وجدانی طور پر کچھ اور محسوس کرتا ہے جبکہ حقائق کچھ اور بتا رہے ہوتے ہیں' اس اعتبار سے بھی یہ مسئلہ پیچیدہ ہے۔ البتہ ہمارے سامنے اس وقت مسئلہ یہ نہیں ہے کہ انسانی عقل میں یہ مسئلہ کہاں ٹکراتا ہے۔ جب اہلِ سُنّت اس پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کا اصل مطمحِ نظر نصوص ہوتی ہیں۔ کچھ نصوص میں انسان سے ارادہ سلب کر لیا گیا ہے اور ہر جگہ اللہ کی مشیت ہی کا تصرف بتایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر:

﴿وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۹﴾﴾ (التکویر)

''اور تمہارے چاہے بھی کچھ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اللہ نہ چاہے جو تمام جہانوں کا ربّ ہے۔''

﴿وَلَوۡ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ کُلُّہُمۡ جَمِیۡعًا ؕ﴾ (یونس: ۹۹)

''اور (اے نبی ﷺ!) اگر آپ کا رب چاہتا تو زمین میں جتنے لوگ بھی ہیں سب کے سب ایمان لے آتے۔''

﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (یونس:۱۰۰)

''کسی جان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ ایمان لائے مگر اللہ کے اِذن سے۔''

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا﴾ (البقرۃ:۲۵۳)

''اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے۔''

﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ﴾ (الاعراف:۱۷۹)

''اور ہم نے جہنّم کے لیے پیدا کیے ہیں بہت سے جنّ اور انسان۔''

دوسری جگہ انسان کی طرف ارادے کی نسبت بھی ہے۔ مثلاً:

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ②﴾ (الدھر)

''ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے ملے جلے نطفے سے، ہم اس کو اُلٹتے پلٹتے رہے، پھر ہم نے اس کو بنا دیا سننے والا، دیکھنے والا۔''

﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (الکھف:۲۹)

''اور آپؐ کہہ دیجیے کہ یہی حق ہے تمہارے رب کی طرف سے۔ تو اب جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔''

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا﴾ (الجاثیۃ:۱۵)

''جس کسی نے اچھا کام کیا تو اُس نے اپنے ہی (بھلے کے) لیے کیا، اور جس کسی نے برا کام کیا تو اس کا وبال بھی اُسی پر ہوگا۔''

جبرِ متوسط

دونوں طرف متعدد نصوص موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان نصوص کو کیسے مانا جائے؟ جو فرق سامنے آتے ہیں، مختلف گروہوں نے انہی سے اپنا اپنا موقف اخذ کیا۔ کسی نے ایک طرح کی نصوص پر توجہ مرکوز کی اور کسی نے دوسری نصوص پر۔ کسی نے اپنے آپ کو قدریہ بنا لیا اور انسانی ارادے کو آزاد قرار دے دیا، جبکہ کسی نے دوسری نصوص پر ڈیرا جما کر انسانی ارادے کو بالکل مجبور ٹھہرا دیا اور انسان کو جمادات کی مانند قرار دیا جنہیں خارجی عوامل حرکت دیتے ہیں۔ اہلِ سُنّت نے کہا کہ ہم دونوں طرف کی آیات کو یکساں مانتے ہیں۔ جہاں انسان کی طرف ارادے کی نسبت ہوئی ہے، ہم بھی ارادے کی نسبت مانتے ہیں۔ جہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا کہ انسان کا ارادہ، چاہے وہ جزوی ارادہ ہو جو ابھی اسے کرنا ہے، وہ بھی اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے، تو ہم یہ بھی مانتے ہیں۔ لہٰذا اہلِ سُنّت کے مسلک کو ''جبرِ متوسط'' کہا جاتا ہے۔

لیکن اسے ''جبر'' کیوں نہیں کہتے؟ اس لیے کہ انسان کو اختیار دیا گیا ہے۔ اس کے پاس اختیار ہے کہ وہ عمل کرے یا نہ کرے، ایمان لائے یا نہ لائے۔ البتہ اسے اپنے اختیار میں اختیار نہیں ہے، یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کی

مرضی نافذ العمل ہوتی ہے‘ لیکن وہ انسان کے ارادے کے ذریعے نافذ العمل ہوتی ہے۔ اللہ کا علم اور اُس کا ارادہ یہ ہے کہ انسان اپنے ارادے سے یہ کام کرے گا۔ اس لیے اسے جبر نہیں کہا جا سکتا‘ کیونکہ جبر وہاں ہوتا ہے جہاں مجبور شخص اپنی مرضی کے خلاف کرنے پر آمادہ ہو جائے (اسی کو اکراہ کہتے ہیں)۔ لیکن جہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی سے کچھ کرواتے ہیں‘ وہ اپنی مرضی سے وہ کام کرتا ہے۔

اختیار واسطۂ جبر ہے

شیخ مصطفیٰ صبری نے اسے بہت خوب صورت الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ہر جبر میں ایک ’’واسطۂ جبر‘‘ ہوتا ہے۔ واسطۂ جبر کبھی ڈنڈا بھی ہو سکتا ہے کہ ڈنڈے کے زور پر کام کروالیا جبکہ وہ شخص نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ یہاں واسطۂ جبر کیا ہے؟ یہاں واسطۂ جبر اس کا اپنا اختیار ہے۔ انہوں نے مثال دی کہ اگر آپ کسی شخص کو قائل کر کے کسی کام پر آمادہ کر لیں‘ تو گویا آپ نے اس کے ارادے پر دخل اندازی تو کی ہے‘ لیکن وہ شخص اپنی مرضی سے قائل ہو کر وہ کام کر رہا ہے۔ خدا کا ارادہ اسی طرح عمل پذیر ہوتا ہے۔ وہ کبھی بھی بندے کے ارادے سے ٹکرا کر کام نہیں کرتا۔ ایسا نہیں ہوتا کہ اللہ نے زبردستی کروایا اور وہ نہیں چاہ رہا تھا‘ بلکہ بیچ میں جو واسطۂ جبر ہے وہ اختیار ہے۔ جب واسطۂ جبر اختیار ہوا تو انسان کا عمل کلیتاً اختیاری ہو گیا۔

شیخ مصطفیٰ صبری فرماتے ہیں کہ تکلیف اور مسئولیت کے لیے بس یہ بات کافی ہے کہ واسطۂ جبر انسان کے اندر اختیار کی صورت میں رکھا گیا ہے۔ البتہ اس اختیار کی تخلیق میں اور اس پر اثر انداز ہونے والے عوامل جو انسان کے ارادے اور اختیار کو بناتے ہیں‘ اس میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں۔ یعنی انسان عمل میں مختار ہے لیکن اپنے اختیار میں مختار نہیں ہے۔ اس کی فلسفیانہ تشریح بہت تفصیلی ہے‘ لیکن خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ اختیار کی ماہیت ہی یہ ہے کہ اختیار تو ہے لیکن اس پر اثر انداز ہونے والے عوامل انسان کے تابع نہیں ہوتے۔ ہر انسان یہ جانتا ہے کہ اس کے ارادے کی تحریکات اور محرکات عموماً اس کے اختیار سے خارج ہوتے ہیں۔

لہٰذا جہاں معتزلہ نے یہ کہا کہ انسان اپنا ارادہ خود پیدا کرتا ہے‘ وہ بھی یہ مانتے ہیں کہ ارادے پر جو چیزیں اثر انداز ہوتی ہیں وہ انسان کے اختیار میں نہیں ہیں۔ لہٰذا بالآخر کسی نہ کسی مرحلے پر پہنچ کر جبر لازم آ ہی جاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اشاعرہ وماتریدیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ بالواسطہ (اختیار کے ذریعے) ارادہ پیدا فرما رہے ہیں‘ جبکہ معتزلہ کے نزدیک جزوی ارادہ تو انسان خود پیدا کر رہا ہے لیکن اس ارادے کو پیدا کرنے والے عوامل اس کے اختیار میں نہیں ہیں۔

سرِّ قدر ماورائے عقل ہے

بہرحال اہلِ سنّت کہتے ہیں کہ ہم دونوں طرف کی تمام آیات کو مانتے ہیں اور ان کا اقرار کرتے ہیں۔ اب اصل مسئلہ کہاں آتا ہے؟ وہ یہی ہے کہ ان دونوں طرح کی نصوص میں توافق کیسے ہوگا! شیخ مصطفیٰ صبری علیہ الرحمہ کی وضاحت سے بھی مسئلہ مکمل طور پر حل نہیں ہوتا۔ انسان کا اختیار ہے‘ لیکن جب یہ کہہ دیا کہ اختیار سے بھی وہی

ہو گا جو اللہ نے ارادہ کیا ہے‘ تو پھر یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے کیسے متوافق ہوتی ہیں؟ کیسے ان میں مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے؟ یہی وہ ’’روحِ قدر‘‘ یا ’’سرِّ قدر‘‘ ہے جو انسانوں سے مخفی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکلف بنایا ہے اور اللہ کے ارادے ہی سے سب کچھ ہو گا‘ یہاں تک کہ انسان کا ارادہ بھی اللہ کے ارادے کے تابع ہو گا‘ تو ان میں توافق کیسے ہو گا؟

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ مسئلہ خلافِ عقل نہیں بلکہ ماورائے عقل ہے۔ اس لیے کہ عقل دونوں باتوں کو اپنی اپنی جگہ مانتی ہے۔ عقل یہ کہتی ہے کہ انسان کے پاس ارادہ ہونا چاہیے کیونکہ وہ مکلف وجود ہے‘ اور عقل یہ بھی کہتی ہے کہ خدا وہی ہے جس کے ارادے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ عقل نے دونوں جگہ جو قضیے مانے ہیں وہ درست ہیں۔ ایک طرف انسان چونکہ مسئول اور مکلف وجود ہے تو اس کے پاس ارادہ اور قدرت ہونی چاہیے۔ عقل نے یہ بات تسلیم کر لی۔ دوسری طرف عقل نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ خدا وہ ہے جس کے ارادے‘ علم اور قدرت کے بغیر کائنات میں کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص مسلمان ہو جائے اور اللہ کی مشیت نہ ہو‘ یا کوئی شخص کافر ہو جائے اور اللہ کی مشیت نہ ہو۔ قرآن مجید اور احادیثِ نبویہ میں ہر وقت اللہ تعالیٰ سے توفیق کے طالب رہنے کا ذکر ہے۔ جس کو اللہ توفیق دے وہ ایمان لائے گا اور جس کو توفیق نہ ملے وہ ایمان نہیں لا سکتا۔ یہ سب باتیں بتا رہی ہیں کہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے معونت اور امداد حاصل نہیں ہوتی تو انسان کچھ نہیں کر سکتا‘ ایمان بھی نہیں لا سکتا۔

لہٰذا عقلِ صحیح دونوں باتیں مانتی ہے۔ خدا بھی ایسا ہی قادرِ مطلق اور مرید مطلق ہے اور انسان بھی مختار ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ خدا کے ارادے اور بندے کے ارادے میں توافق کیسے ہو گا؟ یہ توافق خارج از عقل ہے۔ اس لیے کہ اللہ کے ارادے اور قدرت کی حقیقت ہم سے ماوراء ہے‘ اور جن دو چیزوں میں توافق کرنا ہے ان دونوں کی حقیقت اور ماہیت جاننا ضروری ہے‘ جو ہم نہیں جان سکتے۔ لہٰذا توافق نہیں ہو سکے گا‘ اگرچہ دونوں قضیے اپنی جگہ بالکل درست ہیں۔ انسان کے پاس بھی ارادہ ہونا چاہیے‘ اور اللہ کے ارادے کے سوا کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ اہلِ سُنّت کا عقیدۂ قدر ہے۔

قرآن حکیم کی ایک آیت کے بارے میں علماء نے فرمایا ہے کہ وہ عقیدۂ قدر کا خوب صورت بیان ہے‘ کیونکہ اس میں تمام نصوص کو جمع کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾﴾

’’اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک ہی اُمّت بنا دیتا‘ لیکن وہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اور تم سے ضرور پوچھا جائے گا اُس بارے میں جو کچھ تم کرتے تھے۔‘‘

پہلے مشیت کا بیان آیا: ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک اُمّت بنا دیتا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں نہیں بنایا؟ اس کا جواب ’’وَلٰكِنْ‘‘ سے دیا جو استدراک کے لیے ہے۔ ﴿وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ وہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ یہ عقیدۂ تقدیر کا

مکمل بیان ہوگیا۔ اب انسان کی مسئولیت کہاں ہے؟ آیت کا اگلا جزو اس کا جواب ہے:

﴿وَلَتُسۡـَٔلُنَّ عَمَّا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ﴿۹۳﴾﴾

''اور جو تم عمل کرتے رہے ہو اس کے بارے میں تم سے سوال ضرور ہوگا۔''

یہ اللہ کی مشیت اور ارادے کا بیان بھی ہے اور انسان کو مکلف بنانے کا بیان بھی۔ جب سارا اختیار اللہ کے پاس ہے تو سوال انسان سے کیسے ہوگا؟ یہی سرِّ قدر ہے‘ یہی روحِ قدر ہے‘ اور یہی وہ راز اور لغز (پہیلی) ہے جو انسانی عقل سے ماورا ہے اور انسان اسے سمجھ نہیں پا رہا‘ اگرچہ دونوں قضیے عقلی بھی ہیں اور شرعی بھی‘ اور دونوں اپنی جگہ درست ہیں۔

یہ ہے وہ مسئلہ جسے عقیدۂ تقدیر کہتے ہیں اور اسے ماننا بہت ضروری ہے۔ اس عقیدے سے یہ بالکل لازم نہیں آتا کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ جائے اور کوئی عمل نہ کرے۔ اس عقیدے سے کم ہمتی اور پستی بھی لازم نہیں آتی‘ بلکہ قوتِ لازم آتی ہے۔ اگر اسے صحیح طریقے سے سمجھا جائے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ اگر خدا ایسا نہ ہو تو اسے خدا ماننے میں ہی تامل ہو جاتا ہے‘ کیونکہ اگر میرا ارادہ خدا کے ارادے کے سوا کچھ کر رہا ہے تو میں شاید خدا کو نہیں مان رہا بلکہ اپنے جیسے ایک وجود کو مان رہا ہوں‘ گویا میرے ارادے کے تابع خدا کا ارادہ ہوگیا۔ لہٰذا یہ عقیدۂ قدر ہے‘ اسے اسی طرح جاننا چاہیے۔ اس میں زیادہ موشگافیوں کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے‘ اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنی چاہیے۔

❁❁❁

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کی ویب سائٹ

www.khuddamulquran.org

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ مرکزی انجمن خدّام القرآن کے قیام کے مقاصد اور ان کے حصول کا طریقہ کار
☆ ادارے کے تحت جاری مختلف علمی و تعلیمی کورسز کی تفصیل
☆ صدرِ مؤسس کے مختلف آڈیو/ ویڈیو خطابات
☆ صدرِ انجمن کے دروسِ قرآن اور ڈاکٹر محمد رشید ارشد کے دروسِ حدیث
☆ صدرِ انجمن اور امیر تنظیم اسلامی کے خطاباتِ جمعہ
☆ صدرِ مؤسس کی شائع شدہ کتابوں کے ای ایڈیشن
☆ حکمتِ قرآن‘ میثاق اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr.Israr Ahmad

Surah At-Tawbah (9)

سُوْرَةُ التَّوْبَةِ

Ayāt 25 to 29

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّ يَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ
شَيْـًٔا وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى
رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَ عَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٧﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً
فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖۤ اِنْ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٨﴾ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ
وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿٢٩﴾

Ayah 25:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّ يَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ

Indeed Allah has given you ˹believers˺ victory on many battlefields, even at the Battle of Ḥunayn

As previously noted, this discourse, comprising the first, fourth, and fifth sections, was revealed in Zul-Qa`dah of 9 AH, after the Battle of Hunayn had occurred in Shawwāl of 8 AH.

اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ

When you took pride in your great numbers

Clearly, not all Muslims in the army were overcome with pride in their numbers. During the Battle of Hunayn, the Muslim forces numbered twelve thousand—a figure unmatched in any previous battle. Of these, ten thousand were those who had accompanied the Prophet ﷺ during the conquest of Makkah, while two thousand joined from Makkah itself. Most of these new additions were recent converts to Islam following the conquest. It is also possible that some were still polytheists who, as subjects of the Muslim state, joined the army in roles such as auxiliaries or servants.

The expedition targeted the tribes of Hawāzin and Thaqīf, who resided in Tā`if and its surrounding fertile valleys. Despite their smaller numbers and modest weaponry, the Muslims had previously triumphed over much larger and better-equipped forces of disbelievers. However, on this occasion, emboldened by their numerical strength, some Muslims expressed overconfidence, declaring, "Today, no one can overcome the Muslims!"

Meanwhile, the tribes of Hawāzin and Thaqīf had strategically positioned their highly skilled archers on the surrounding hills and ravines, fortifying key locations. As the Muslim army entered the valley of Hunayn, these archers unleashed a relentless barrage of arrows from elevated positions. With arrows raining down from both sides, the Muslims, caught in the low ground, were thrown into chaos. The unexpected assault caused panic within the ranks. As the vanguard retreated in disarray, they inadvertently swept others back with them.

Some narrations state that, at one point, only 30 or 40 companions remained with the Prophet ﷺ. Allāma Shibli رحمة الله عليه recorded this figure in his *Sīrat-un-Nabī* ﷺ. However, his student, Syed Sulaiman Nadwi رحمة الله عليه, later offered a differing opinion, suggesting that 300 or 400 individuals stayed with the Prophet ﷺ. Even so, in an army of 12,000, having only 300 or 400 remain was no small matter.

In this critical moment, the Prophet ﷺ dismounted his steed, took the banner into his own hands, and loudly proclaimed: " اَنا النَّبِیُّ لا کَذِبْ، اَنا

"انا النبي لا كذب انا ابن عبد المطلب"—"I am the Prophet, without a doubt! I am the grandson of `Abd-ul-Muttalib!" That is, I am undoubtedly a Prophet—whether these twelve thousand stand with me or I stand alone. And I am the grandson of `Abdul-Muttalib, present personally here on the battlefield. He ﷺ then called out to his companions: "إليّ يا عباد الله!"—"To me, O servants of Allah!" Following this, the Prophet ﷺ instructed his uncle, `Abbās رضي الله عنه, whose voice was exceptionally loud, to summon the Muhājirūn and Ansār. `Abbās رضي الله عنه cried out: "Where are the people of Badr? Where are those who pledged under the tree (*Bay`at-ur-Ridhwān*)?" Hearing his call, the scattered companions began returning to the Prophet ﷺ. Before long, the army regrouped. The Muslims launched a powerful counterattack, and despite fierce resistance, they ultimately achieved victory.

فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴿٢٥﴾

But they proved of no advantage to you. The earth, despite its vastness, seemed to close in on you, then you turned back in retreat.

Ayah 26:

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا

Then Allah sent down His reassurance upon His Messenger and the believers, and sent down forces you could not see

وَ عَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٦﴾

And punished those who disbelieved. Such was the reward of the disbelievers.

Ayah 27:

ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٧﴾

Then afterwards Allah will turn in grace to whoever He wills. And Allah is All-Forgiving, Most Merciful.

Ayah 28:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ

O believers! Indeed, the polytheists are ˹spiritually˺ impure, so they should not approach the Sacred Mosque after this year.

This means that although the polytheists participated in the pilgrimage of this year (9 AH), from the following year onward, no polytheist would be permitted to perform hajj or come near the Ka`bah or the Sacred Mosque.

وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ عَيۡلَةً فَسَوۡفَ يُغۡنِيۡكُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖۤ اِنۡ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۸﴾

If you fear poverty Allah will enrich you out of His bounty, if He wills. Surely, Allah is All-Knowing, Al l-Wise.

If anyone fears that this command might reduce the number of pilgrims and, consequently, diminish the income from their offerings and sacrifices, let him place his complete trust in Allah. Soon, such an abundance of worldly wealth will come your way that you will struggle to manage it.

Indeed, within a few years after the Prophet ﷺ's passing, the situation changed entirely. The conquests of the Persian and Roman empires brought an overwhelming influx of spoils of war, fulfilling precisely what the Prophet ﷺ had foretold in his final days. He ﷺ said:

((فواللهِ لا الفقر أخشى عليكم، ولكن أخشى عليكم أن تبسط عليكم الدنيا كما بسطت على من كان قبلكم، فتنافسوها كما تنافسوها، وتهلككم كما أهلكتهم)) [متفق عليه]

"By Allah, I do not fear poverty for you, but I fear that the world will be opened up for you (wealth and riches will pile at your feet), as it was opened up for those before you. Then you will compete for it as they competed for it, and it will destroy you as it destroyed them."

Ayah 29:

قَاتِلُوا الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ وَ لَا يَدِيۡنُوۡنَ دِيۡنَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ حَتّٰى يُعۡطُوا الۡجِزۡيَةَ عَنۡ يَّدٍ وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ ﴿۲۹﴾

> **Fight those who do not believe in Allah and the Last Day, nor comply with what Allah and His Messenger have forbidden, nor embrace the religion of truth from among those who were given the Scripture, until they pay the tax, willingly submitting, fully humbled.**

This ayah also conveys a profound philosophy of the Deen, differentiating the case of the Arab polytheists from the rest of humanity. According to Surah At-Tawbah, ayah 5, once the grace period granted to the Arab polytheists expired, they were left with no choice but to accept faith, face death, or leave the Arabian Peninsula. Their situation was exceptional because Muhammad ﷺ, as the Messenger of Allah, had completed the ultimate proof (*itmām al-hujjah*) against them. By rejecting his prophethood, they became deserving of Divine punishment in the form of annihilation.

In contrast, a different law applies to the People of the Book (Jews and Christians) and the rest of humanity. For those outside the Arabian Peninsula during the Prophet ﷺ's time, who had not directly rejected his message, and for all people until the Day of Judgment, this ultimatum does not apply.

After the Prophet ﷺ's earthly life, while he remains present spiritually as the Messenger of Allah, he is no longer physically present. Consequently, no nation can now directly reject his invitation and thereby become deserving of the punishment of obliteration.

For the rest of humanity, the principle is that combat will continue until they accept the dominance of Islam as a governing system. However, individuals will not be forced to embrace Islam. Non-Muslims may remain adherents of their respective religions while living as citizens of the Islamic state, provided they pay *jizyah*.

In accordance with this principle, during the era of the Rightly Guided Caliphate (*Khilāfah Rāshidah*), three options were presented to any nation before military engagement:

1. Accept Islam: By doing so, you will attain equal citizenship in the Islamic state, with full rights and privileges.

2. Submit to the authority of the Islamic state: Acknowledge the supremacy of Islam, live as compliant citizens under the Islamic state, and pay *jizyah*. This will grant you complete freedom to practice your religion, whether you are Jews, Christians, Magians, Hindus, or others.

3. Prepare for war: If neither option is acceptable and you insist on upholding a system of falsehood on this land, confrontation will become inevitable.

Ayāt 30 to 35

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِۨ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ
يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٣٠﴾ اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ
رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَ مَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوْۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰهَ
اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٣١﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ
نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٣٢﴾ هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ
وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿٣٣﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ
النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٣٤﴾ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ
جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿٣٥﴾

Ayah 30:

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِۨ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ

The Jews say, "Ezra is the son of Allah," while the Christians say, "The Messiah is the son of Allah."

ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ

Such are their baseless assertions, only parroting the words of earlier disbelievers.

Their fabricated beliefs have no foundation in reality; rather, they are merely imitating the ideas of earlier polytheists. Historical evidence indicates that the concept of the Trinity was first introduced by the followers of the ancient Egyptian religion known as Mithraism. In this

system, three figures were central: "God the Father, Horus the Son of God, and Isis the Mother Goddess." This was the earliest concept of the Trinity, originating in Egypt.

Later, as Saint Paul began spreading Christianity and extending its reach to non-Israelite Gentiles, similar concepts were adopted from Egyptian beliefs to make Christianity more appealing to the masses. As a result, the initial version of the Trinity incorporated into Christianity consisted of "God, Jesus the Son of God, and Mary the Blessed Mother." This adaptation clearly drew from the foundational ideas of Mithraism, reflecting a direct borrowing of its structure.

قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝۳۰

May Allah condemn them! How can they be deluded ˹from the truth˺?

Ayah 31:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ

They have taken their rabbis and monks as well as the Messiah, son of Mary, as lords besides Allah

Another significant deviation among the Christians was their inclusion of their scholars and monks, along with `Īsa عليه السلام, as partners in divinity. `Īsa عليه السلام was explicitly regarded as one of their three gods, and they worshipped him accordingly. However, their recognition of scholars and monks as deities took on a different form.

When `Adi ibn Hātim رضي الله عنه, a former Christian who embraced Islam, sought clarification from the Prophet صلی اللہ علیہ وسلم regarding this ayah, the Prophet صلی اللہ علیہ وسلم explained:

((أما إنهم لم يكونوا يعبدونهم ولكنهم كانوا إذا أحلوا شيئا استحلوه وإذا حرموا عليهم شيئا حرموه)) [سنن الترمذی: 3095]

"They did not worship them (their rabbis and monks) directly, but when they declared something lawful, the people accepted it as lawful, and when they declared something unlawful, the people accepted it as unlawful."

This underscores a critical principle: the authority to determine what is *halāl* and *harām* belongs exclusively to Allah. If anyone else assumes this right, he is effectively claiming a share in Allah's divinity. Moreover, anyone who acknowledges such authority in others is, in essence, accepting them as lords besides Allah.

Even today, the Pope holds absolute authority to issue decrees on religious matters. For instance, he absolved the Jews of the two-thousand-year-old accusation of crucifying `Īsa عليه السلام through a single decree, effectively granting himself the power to rewrite history. Similarly, he can declare something lawful (*halāl*) as unlawful (*harām*) or vice versa.

Comparable beliefs are found among the Ismā`īlis, who regard their "*Imām Hādhir*" as infallible, attributing to him the absolute authority to legislate matters of *halāl* and *harām*. This effectively nullifies the Shariah. Such practices are particularly evident among the Ismā`īlis of Gujarat (India). In contrast, the Ismā`īlis of Hunza, who belong to an older tradition and migrated from other regions, still adhere to the Shariah.

When the Ismā`īlis of Gujarat began propagating their beliefs among the local Hindu population, they employed tactics reminiscent of Saint Paul. To appeal to Hindu sensibilities, they abandoned the Shariah and adopted the Hindu concept of *avatars* (divine incarnations). They presented `Ali رضي الله عنه as the tenth avatar, aligning with the Hindu belief in nine prior avatars. Consequently, the doctrine of the *Dashtam Avatar* became a permanent feature of their faith. Additionally, their *Imām Hādhir* is believed to hold the authority to abrogate any command of the Shariah, declare the lawful as unlawful, or render the unlawful permissible at his discretion.

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۳۱

Even though they were commanded to worship none but One God. There is no god ˹worthy of worship˺ except Him. Glorified is He above what they associate ˹with Him˺!

Ayah 32:

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِــُٔـوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ

They wish to extinguish Allah's light with their mouths

وَيَأْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٣٢﴾

But Allah will only allow His light to be perfected, even to the dismay of the disbelievers.

This statement subtly mocks the Jews, alluding to the fact that they always rely on covert schemes to undermine Islam rather than openly confronting it. Maulāna Zafar `Ali Khan expressed the essence of this ayah in these words of his poetry:

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

The light of God laughs at the machinations of disbelief,
This lamp cannot be extinguished by mere breaths!

Ayah 33:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿٣٣﴾

He is the One Who has sent His Messenger with ˹true˺ guidance and the religion of truth, making it prevail over all others, even to the dismay of the polytheists.

This ayah is a clear testament to the distinctiveness and finality of the messengerhood of Muhammad ﷺ, the Messenger of Allah. As previously mentioned, the primary purpose of the Prophet ﷺ's mission, like that of other prophets and messengers, was to deliver glad tidings, issue warnings, remind, invite, and convey Allah's message. This is articulated in Surah An-Nisā:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ [النساء:165]

"Messengers as bearers of good news and as warners, so that mankind will have no argument against Allah after the messengers."

(An-Nisā 165)

In addition to this fundamental mission, the Prophet ﷺ's prophethood carries a unique and exclusive purpose: the completion of messengerhood, which involves the practical establishment and dominance of the Deen. These two ayāt emphasize this distinctive and ultimate dimension of the Prophet ﷺ's mission.

This pair of ayāt appears in the same sequence in Surah As-Saff (ayāt 8 and 9). The first ayah in Surah As-Saff features a slight variation:

﴿يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [الصف:8]

> "They want to extinguish Allah's light with their mouths, but Allah will perfect His light even though the disbelievers dislike it." (As-Saff 8)

The second ayah, however, is identical to the one in Surah At-Tawbah, with no differences whatsoever.

I have authored a comprehensive 24-page article titled "نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت" (The Purpose of the Prophethood of the Noble Prophet ﷺ), which explains this ayah in detail. The article demonstrates that striving for the ultimate fulfillment of the unique and distinctive purpose of the Prophet ﷺ's prophethood—the establishment of the Deen and its supremacy in the world—is an obligation upon all of us as his followers. While some have sought to shirk this responsibility by arguing that it is Allah, not humans, who will establish the dominance of the Deen, a thorough reading of this article will, *in shā Allah,* clarify the truth of the matter.

Ayah 34:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ

> **O believers! Indeed, many rabbis and monks consume people's wealth wrongfully**

In various Muslim communities, religious leaders have been known by different names and titles. Among the Israelites, they were called *Ahbār* and *Ruhbān*. The ayah under discussion highlights that many from this class were engaged in the reprehensible act of accumulating wealth and property through wrongful and unlawful means.

For an ordinary individual pursuing worldly endeavors, there is no objection to earning wealth or acquiring property through legitimate means. However, when someone dedicated to serving the Deen, known and respected in that capacity, becomes engrossed in amassing wealth and property—exploiting his religious standing to unlawfully seize the

wealth of others and making the accumulation of riches his ultimate goal—he becomes the worst of all people under the heavens. Here, it is fitting to mention an eye-opening hadīth of the Prophet ﷺ, one brimming with admonition and insight:

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((يُوشِكُ أَنْ يَأْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقَى مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا اسْمُهُ، وَلَا يَبْقَى مِنَ الْقُرْآنِ إِلَّا رَسْمُهُ، مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدَى، عُلَمَاؤُهُمْ شَرُّ مَنْ تَحْتَ أَدِيمِ السَّمَاءِ، مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيهِمْ تَعُودُ))
[رَوَاهُ البيهقي في شعب الايمان]

\`Ali رضي الله عنه narrates that the Messenger of Allah ﷺ said: "A time will come upon the people when nothing will remain of Islam except its name, and nothing will remain of the Quran except its script. Their mosques will be bustling but devoid of guidance. Their scholars will be the worst under the heavens; trials will emerge from them, and to them, they will return."

وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ

And hinder ⌜others⌝ from the Way of Allah.

When a religious movement arises—when a sincere servant of Allah calls people toward the Deen—these religious leaders perceive their positions of authority to be under threat. They fear losing their devoted followers to another call, as it is through the contributions and offerings of these followers that their wealth grows and their properties multiply. Why, then, would they allow their adherents to respond to another call?

وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۳۴﴾

Give good news of a painful torment to those who hoard gold and silver and do not spend it in Allah's cause.

Regarding this ayah, Abu Zarr Ghifāri رضي الله عنه held the personal opinion that it is absolutely prohibited for a Muslim to keep gold and silver in his possession. However, other companions رضي الله عنهم did not share this view. The general principle in the Deen is that wealth earned through lawful means, provided zakāh is duly paid on it, is permissible to retain, irrespective of its amount or whether it is in the form of gold or silver.

Upon a person's death, such wealth lawfully passes to his heirs in accordance with the laws of inheritance.

The law of inheritance revealed by Allah itself serves as evidence that owning wealth is not inherently unlawful. If wealth were not to be accumulated, what would form the basis of inheritance, and what practical purpose would the law of inheritance fulfill? Therefore, the Quranic injunctions encouraging generous spending fall within the scope of its spiritual and moral teachings. For instance, the command ﴿قُلِ الْعَفْوَ ؕ﴾ (Al-Baqarah 219), meaning "Spend whatever is beyond your needs in the way of Allah," reflects this principle.

During the caliphate of `Uthmān رضي الله عنه, despite Abu Zarr Ghifāri رضي الله عنه's opposition, it was legally established that possessing gold and silver is not categorically prohibited for Muslims. Nevertheless, Abu Zarr رضي الله عنه remained resolute in his personal stance, refusing to show any flexibility on the matter. His persistent disagreement created a sense of unrest in Madinah, prompting Uthmān رضي الله عنه to direct him to leave the city. Complying with this directive, Abu Zarr رضي الله عنه departed from Madinah and chose to settle in the desert, where he built a small hut and began living in seclusion.

In my view, the directive of this ayah is specifically directed at the *ahbār* and *ruhbān*—the religious leaders—and particularly applies to those who dedicate their time and abilities to the service of the Deen without any independent source of income. Such individuals often rely on gifts and financial support from the community to fulfill their needs with dignity. For instance, the Prophet ﷺ himself met his necessities, provided for the sustenance of the Mothers of the Believers رضي الله عنهن, and supported his relatives through the *Bayt al-Māl.* (In times of insufficient resources, he ﷺ even endured hunger.) The same approach was adopted by the Rightly Guided Caliphs رضي الله عنهم.

It is therefore incumbent upon such religious leaders to utilize the donations and stipends they receive solely to meet their own essential needs and those of their dependents in a reasonable and dignified manner. However, if they exploit their position to amass wealth and acquire properties, and this wealth is subsequently passed on to their

heirs through inheritance, the injunctions of this ayah would apply to them in full measure.

Even today, if one seeks to distinguish between the *ulamā al-haqq* (righteous scholars) and the *ulamā as-sū* (corrupt scholars), this ayah, in my opinion, serves as a definitive litmus test. If a religious leader or scholar dies leaving behind significant wealth or property acquired through his religious career, he is undoubtedly among the *ulamā as-sū*.

Ayah 35:

يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ ؕ

The Day ˹will come˺ when their treasure will be heated up in the Fire of Hell, and their foreheads, sides, and backs branded with it.

هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿٣٥﴾

˹It will be said to them,˺ "This is the treasure you hoarded for yourselves. Now taste what you hoarded!"

Ayāt 36 to 37

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ
حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ۬ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا
يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٣٦﴾ اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّ يُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ
سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٣٧﴾

Ayah 36:

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ

Indeed, the number of months ordained by Allah is twelve—in Allah's Record since the day He created the heavens and the earth

According to the Divine system ordained by Allah and His legislative decree, the number of months has been set at twelve.

مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ

Of which four are sacred.

The four months of Zul-Qa`dah, Zul-Hijjah, Muharram, and Rajab are known as *al-ashhur al-hurum* (the sacred months), during which acts such as warfare are prohibited.

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۬ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ

That is the Right Way. So do not wrong one another during these months.

According to the Divine law, these four months have been sacred since the very beginning. Therefore, do not violate their sanctity, thereby wronging yourselves. This refers to the practice of the Quraysh, who would arbitrarily alter the sacred months. If a sacred month coincided with a campaign or conflict, instead of halting their warfare in observance of its sanctity, they would designate another month as sacred in its place. Through such manipulations, they had completely disrupted the calendar.

By Allah's decree, however, the calendar—having undergone numerous alterations and adjustments—was restored to its original state by the year 10 AH. This is why the Prophet ﷺ declared in his Farewell Sermon:

((إن الزمان قد استدار كهيئته يوم خلق اللّٰه السماوات والارض ....)) [متفق عليه]

"Time has completed its cycle and returned to its original state as it was on the day Allah created the heavens and the earth."

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝٣٦

And fight the polytheists together as they fight together against you. And know that Allah is with those mindful ˹of Him˺.

Ayah 37:

اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

Reallocating the sanctity of ˹these˺ months is an increase in disbelief, by which the disbelievers are led ˹far˺ astray.

This signifies that altering the order of the sacred months—shifting them forward or backward from their rightful position—adds yet another act of disbelief to the framework of *kufr*.

يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ

They adjust the sanctity one year and uphold it in another, only to maintain the number of months sanctified by Allah

فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ

Violating the very months Allah has made sacred.

This means that by altering the sequence of the months, they effectively made permissible the months that Allah had declared sacred. The Arab polytheists acknowledged the sanctity of four months in the year but would arbitrarily rearrange their order to align with their desires. By the end of the year, they would ensure the total number of sacred months was maintained, despite having violated their sanctity.

زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝٣٧

Their evil deeds have been made appealing to them. And Allah does not guide the disbelieving people.

This concludes the five sections addressing the specific mission of the Prophet ﷺ, where the final and comprehensive directives on the matter have been delivered. With the sixth section, the discussion transitions to the Battle of Tabūk. At this point, it is pertinent to revisit its contextual background.

In 6 AH, immediately following the Treaty of Hudaybiyyah, the Prophet ﷺ began sending letters and envoys to rulers beyond Arabia. Among these was a letter addressed to Shurahbīl ibn `Amr, the governor of Busra (Syria), a vassal of the Roman Empire. The Prophet ﷺ entrusted this letter to Hārith ibn `Umair Al-Azdi رضي الله عنه. In blatant disregard for diplomatic and moral norms, Shurahbīl had Hārith رضي الله عنه executed. Viewing this act as a declaration of war, the Prophet ﷺ prepared an army of 3,000 companions under the leadership of Zayd ibn Hāritha رضي الله عنه and dispatched them toward Syria.

When the Muslim forces reached Mu`tah, they encountered an opposing army of 100,000 Romans ready for battle. After assessing the overwhelming size of the enemy force, the Muslims engaged in detailed consultations. Despite the gravity of the situation, they resolved

to confront the Roman army, motivated solely by their ardent desire for martyrdom.

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی!

For the believer, martyrdom is both the purpose and the prize—
Not the treasures of war, nor the expansion of empires.

In Jumāda al-Ūla of 8 AH, the two armies confronted each other at Mu`tah. The Prophet ﷺ had appointed Zayd ibn Hāritha رضي الله عنه as the commander of the Muslim army, with two additional commanders designated in the event of his martyrdom. He ﷺ instructed that if Zayd رضي الله عنه were martyred, Ja`far ibn Abi Tālib رضي الله عنه (Ja`far Tayyār) would assume command, and if he too were martyred, `Abdullah ibn Rawwāha رضي الله عنه would take charge. As foreseen, all three commanders were martyred in succession. After the martyrdom of `Abdullah ibn Rawwāha رضي الله عنه, Khālid ibn Walīd رضي الله عنه assumed command on his own initiative. Demonstrating exceptional military acumen, he successfully maneuvered the Muslim army out of the Roman forces' encirclement, ensuring their safety.

In light of the situation arising from the Battle of Mu`tah, the Prophet ﷺ announced the mobilization of a large army to confront the Romans, calling for the use of all available resources. This time, he ﷺ decided to personally lead the expedition. Tabūk, situated approximately 350 miles north of Madinah, was the last city in the Hijāz region, marking the border of the Roman Empire at that time.

The Prophet ﷺ issued a general call to arms, making it obligatory for every capable believer to join the expedition. This was a time of immense trial and challenge for the believers, with multiple hardships compounding the test: a severe drought, the scorching summer heat, the grueling desert journey, an imminent confrontation with the world's superpower, and, to top it all, the fast-approaching harvest season. For most residents of Madinah, their livelihood depended on the date harvest, which was ripe and ready for collection. Joining the expedition meant leaving the dates on the trees, as the women could not undertake the labor-intensive task of harvesting. It was clear that if the men departed, the crop would inevitably go to waste.

The announcement of this expedition placed a heavy burden on the hypocrites, exposing their true nature and malicious intentions. The ayāt in the forthcoming eleven sections, while encompassing various topics, are unified by a recurring theme: the hypocrites. This theme serves as a central thread, with other subjects delicately interwoven like pearls of varying sizes. Although the hypocrites were discussed in detail earlier in Surah An-Nisā, the treatment of this subject in the next eleven sections represents the pinnacle of the Quranic discourse on hypocrisy.

The Prophet ﷺ set out for Tabūk with an army of 30,000. Although Heraclius, the Roman Emperor, was personally present on the opposing side, he seemed to recognize the Prophet ﷺ as a true Messenger of Allah and, therefore, did not dare to engage in battle. The Prophet ﷺ remained in Tabūk for some time, during which several surrounding tribes approached and entered into treaties with him.

While the expedition did not result in direct combat, the Muslim army's march from Madinah to Tabūk, reaching the borders of the Roman Empire, and Heraclius's decision to avoid confrontation was no ordinary event. This campaign not only instilled a sense of awe and respect for the Muslims in the region but also effectively extended the Islamic state's borders to Tabūk. Furthermore, it decisively restored the Muslims' prestige, which had been somewhat affected after the Battle of Mu`tah.

This strategic confrontation with the Roman Empire, initiated through the Tabūk expedition, laid the foundation for further developments during the caliphate of Abu Bakr رضي الله عنه. The immediate dispatch of Usama رضي الله عنه's army from Madinah after the Prophet ﷺ's passing was a direct continuation of this effort.